۲۱ – ۲۸ جنوری ۱۹۷۱ء



مسٹر بھٹو! سازشوں سے خبردار! (مضمون صفحہ ۷ پر ملاحظہ کیجیے)

قیمت: مغربی پاکستان - ۵۰ پیسے
مشرقی پاکستان -



ساقی جاوید

عظیم دن

یہ دن مبارک ، یہ دن مبارک
میرے وطن کے عوام تم کو
نئی سحر کا سلام تم کو
کہ اپنے سینوں کے جلتے زخموں کا نور ہو تم
غیور ہو، باشعور ہو تم
صدی صدی کے ستم رسیدہ غریب لوگو!
اب اِن کو دیکھو۔
جو شب گزیدہ ، شکست خوردہ کھڑے ہُوئے ہیں
جو وقت کے اک نجس اندھیرے میں نیم مُردہ پڑے ہُوئے ہیں
یہی سیاست کے وہ خدا ہیں
یہی وہ مذہب کے دیوتا ہیں
جو آج تک بے ضمیر سمجھے ہُوئے تھے تم کو
روایتوں کے اسیر سمجھے ہُوئے تھے تم کو
درِ عقیدت کے اندھے ، لنگڑے فقیر سمجھے ہُوئے تھے تم کو
اسی لیے وہ مدّعی تھے۔
کہ آج کا دن
"حق اور باطل" کے فیصلے کا عظیم دن ہے
تو آج کے دن
حق اور باطل کا فیصلہ کر دیا ہے تم نے
جو ایک قرضِ وفا تھا تم پر
وہ اب ادا کر دیا ہے تم نے
اب اس کے بعد انتظار ہے اس عظیم دن کا
وہ دن جو یوم الحساب ہوگا
جو فیصلے کی کتاب ہوگا
وہ دن جو آیا تو دیکھ لینا
تمہارے ہاتھوں ہر ایک چہرہ اسی جگہ بے نقاب ہوگا
لہو تمہارا پیا ہے جس نے
عوام کا وہ ہر ایک دشمن
سماج کا وہ ہر ایک مجرم
فلک کے زیرِ عذاب ہوگا
زمیں کے زیرِ عتاب ہوگا
لہو تمہارا گلاب ہوگا

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ

الفتح

کراچی

جلد:- ۱ شمارہ:- ۳۶

۲۱ — ۲۸ جنوری ۱۹۷۱ء

نگرانِ اعلیٰ

شوکت صدیقی

مدیر

ارشاد راؤ

معاونین خصوصی

صفدر میر — منہاج برنا

مجلسِ ادارت

محمود شام - اشرف شاد - وہاب صدیقی

سرورق: — سعید

بحرین، کویت — ۶۰ فلس

دوبئی، قطر — ۵ درہم

سعودی عرب — ۱۵ قرش

انگلستان — ۲ شلنگ، ۶ پنس

اداریہ

لگام دیجئے

انتخابات ہوئے، بھٹو اور مجیب جیت گئے - ہارنے والے کیا کر رہے ہیں، وہ سب کے سامنے ہے - انہوں نے انتخابات کے بعد جو لائحہ عمل تیار کیا تھا، وہ یہ تھا کہ وھن، دھونس اور دھاندلی سے جیت گئے تو پاکستان کو انڈونیشیا بنا دیں گے اور ہار گئے تو بھی پاکستان کو انڈونیشیا بنانے کے لئے کوششیں جاری رہیں گی۔

'الفتح' نے ایک گذشتہ اداریہ میں واضح طور پر لکھا تھا کہ مودودی جماعت اور دوسرے نام نہاد اسلام پسندوں کی شکست سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ دشمن کو ٹھکانے لگا دیا گیا ہے بلکہ اُن کے آئندہ منصوبوں کو خاک میں ملانے کے لئے عوام دوست طاقتوں کو پہلے سے کہیں زیادہ ہوشیار اور متحد ہونا پڑے گا۔

اس تحریر کو زیادہ دن نہیں ہوئے۔ دُشمن کھُل کر سامنے آگیا ہے۔ اُس نے پہلے نوکر شاہی کے ذریعے اچانک روز مرّہ کے استعمال کی اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کرایا۔ عوام میں مہم چلائی کہ بھٹو کیا جیتا ہے، لوگ بھوکوں مرنے لگے ہیں - اس سے یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ مہنگائی بھٹو کی وجہ سے ہوئی ہے - ایک طرف یہ ہو رہا تھا تو دوسری طرف ملوں اور کارخانوں سے مزدوروں کی وسیع پیمانے پر چھانٹی شروع کر دی گئی۔ پہلے صرف مہنگائی تھی، چھانٹی نے بیروزگاری کو جنم دیا اور اس طرح عام شہریوں میں بے چینی اور اضطراب کی لہر نے پُورے



	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
مغربی پاکستان	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
مشرقی پاکستان	۶۰ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

خط و کتابت کے لئے

دفتر ہفت روزہ "الفتح"، ۸۰ ڈی۔ نرسری کمرشل ایریا۔ پی، ای، سی، ایچ، ایس۔ کراچی ۲۹

ایڈیٹر پبلشر ارشاد راؤ ○ مطبع حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد کراچی

مقام اشاعت: ۸۰ ڈی نرسری کمرشل ایریا، پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی ۲۹

مغربی پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

انتخابات میں عوام کا اعتماد حاصل کرنے والوں نے عبوری حکومت کو للکارا کہ وہ نوکر شاہی، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو لگام دے ورنہ عوامی سیلاب کا بند کھل جائے گا۔ اس کی ذمہ داری ہم پر نہ ہوگی۔ مجیب اور بھٹو نے پریس کانفرنسوں اور بیانات کے ذریعے حکام کو خبردار کیا۔ اس کے نتیجے میں عبوری حکومت نے اٹک شوق کے لئے کارروائی تو کی لیکن قیمتیں کم نہیں ہوئیں۔ بیروزگار کئے جانے والے مزدوروں اور بے دخل ہونے والے مزارعین اور ہاریوں کے شب و روز جوں کے توں ہیں۔ اس سازش کے کسی مجرم کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔

"اسلام پسندوں" نے غیر یقینی حالات پیدا کرنے کے لئے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات اقدس کا سہارا بھی لیا، اور ایک بدبخت، سامراجی ایجنٹ، عوام دشمن، ملعون صیہونی مصنف کی ناپاک جسارت کو منظر عام پر لاکر مغربی پاکستان میں لوٹ مار، آتش زنی اور بلوا کروایا۔ پولیس نے جن افراد کو گرفتار کیا ان میں سینکڑوں معصوم اور بے گناہ بھی شامل ہیں۔ یہ گرفتاریاں خانہ پُری کے لئے کی گئی تھیں تو دُوسری بات ہے لیکن اس کے پسِ منظر میں جو خفیہ ہاتھ کام کر رہے ہیں، وہ کیوں آزاد ہیں اور بے گناہ جیلوں میں کیوں سڑ رہے ہیں؟

ہم یہاں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ امریکی اور برطانوی سامراج اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ اس قسم کی تحریروں کی اشاعت کے بعد اپنے ایجنٹوں کے ذریعے اشتعال پھیلائیں اور جب مذہبی جذبات پوری طرح سے بھڑک اُٹھیں تو عوام دوست طاقتوں کو کافر قرار دے کر عوام کے ہاتھوں ہی ان کا قلع قمع کروا دیں۔ یہ حربہ انڈونیشیا میں قتل عام کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اب اسے خوش قسمتی کہیے کہ مظاہروں میں انتخابات میں پیپلز پارٹی کا ساتھ دینے والوں نے بھی حصّہ لیا۔ انھوں نے ناموسِ رسالت پر ناروا حملے کو شدید مذمت کے اظہار کا ذریعہ بنایا جب کہ "اسلام پسندوں" نے لوٹ مار، آتش زنی اور بلوؤں کے لئے راہ ہموار کی۔ عوام ان حرکتوں سے بدظن ہوگئے اور یہ منصوبہ بھی ناکام ہوگیا۔

یہ سازش نئے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے، نام نہاد مزدور تنظیموں کے خود ساختہ راہنماؤں کو استعمال کیا جا رہا ہے اور ہنگامہ آرائی کے لئے فضا کو سازگار بنانے کی سرتوڑ کوششیں کی جا رہی ہیں۔ سازشیوں کا یہ خیال ہے کہ بائیں بازو کے تمام فعّال مزدور رہنما جیلوں میں بند ہیں۔ اُن کی غیر حاضری سے پُورا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں نوکر شاہی سازشیوں کا بھرپور ساتھ دے رہی ہے اور مزدور رہنماؤں کو نہ صرف جیلوں میں ڈالا ہُوا ہے بلکہ سرِعام ان کو ذلیل کرنے کے لئے پاؤں میں بیڑیاں پہنا کر عدالتوں میں پیش کیا جاتا ہے۔

بھٹو اور مجیب ایک نئی آزمائش سے دو چار ہونے والے ہیں۔ اس سے عہدہ برآء ہونے کے لئے اُنھیں حکومت پر زور دینا چاہیئے کہ وہ تمام مزدور رہنماؤں، کارکنوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دے۔ مزدوروں کی رہنمائی کے لئے ضروری ہے کہ اُن کے مفادات کے صحیح نگہبان اُن کے درمیان موجود ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو سازشیوں کو منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں۔

نوکر شاہی نے ان رہنماؤں کو ایک منظم سازش کے تحت جیلوں میں بند کیا ہے۔ اس کے تحت وہ سازشی ٹولے کے مہروں کی لیڈری چمکانے کی فکر میں ہیں۔ نوکر شاہی کو موجُودہ حالات میں اپنا موقف بدلنا ہوگا کہ عوام نے جن کے حق میں فیصلہ دیا ہے، اُن کا احترام کرنا پڑے گا۔ ورنہ عوامی سیلاب کا بند کھُلا تو اُس کے سامنے کوئی جم نہیں سکے گا۔

بھٹو اور مجیب عوامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو اُنھیں نوکر شاہی کا دماغ درست کرنا ہوگا۔ نوکر شاہی کوئی علیحدہ طبقہ نہیں بلکہ اُس نے ہمیشہ حکمران طبقے کی نمائندگی کی ہے۔ اسے یہ باور کرانا ضروری ہے کہ عوام نے جو فیصلہ دیا ہے اُس کی روشنی میں وہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے اشاروں پر ناچنا چھوڑ دیں اور عوام کی خواہشات کو پُورا کریں۔







یحییٰ مجیب اور یحییٰ بھٹو

مذاکرات میں اتفاق رائے

پیدا ہوگیا

کیا بھٹو صدرِ مملکت کا عہدہ قبول کرلیں گے؟

ارشاد راؤ

صدر یحییٰ نے شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کے بعد قوم کو ایک اہم خوشخبری سنائی ہے کہ ملک کے آئندہ وزیر اعظم شیخ مجیب الرحمٰن ہوں گے۔ شیخ صاحب حکومت بنائیں گے۔ میں اقتدار نئی حکومت کے حوالے کر دوں گا۔"

ملک بھر میں صدر یحییٰ کے اس انکشاف کے بعد یہ بحث ہوتی رہی کہ ملک کا آئندہ صدر کون ہوگا؟

نئی حکومت بننے کے بعد صدر یحییٰ کی پوزیشن کیا ہوگی؟

شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے اکثریتی جماعت کی حیثیت سے اقتدار سنبھالا تو مغربی پاکستان کے چار صوبوں کو حکومت میں نمائندگی کیسے ملے گی؟

صدر یحییٰ سے پہلی ملاقات کے بعد شیخ صاحب کو دوسری ملاقات کے موقع پر عوامی لیگ کی پانچ اہم شخصیات کو ساتھ لے جانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

ان ملاقاتوں کے بارے میں رازداری سے کیوں کام لیا جا رہا ہے جب گفت و شنید سے صدر یحییٰ اور شیخ صاحب مطمئن ہیں تو پھر کیا رہ گیا ہے۔ بھٹو صاحب اور صدر یحییٰ کی بات چیت؟

یہ درست ہے کہ عوامی لیگ کے حلقوں میں ان ملاقاتوں کی تفصیلات کے سلسلے میں زبردست احتیاط برتی جا رہی ہے۔ صرف دو عوامی لیگی رہنما جو صدر یحییٰ سے ملاقات کے دوران موجود نہیں تھے، انہیں تفاصیل سے مکمل طور پر آگاہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک جناب ظہیر الدین اور دوسرے ڈاکٹر کمال حسین ہیں۔ ایک مبصر کے مطابق باقی ہر سطح پر عوامی لیگ "ٹائٹ لپس" (مکمل خاموشی) سے کام لے رہی ہے۔

مبصرین نے انکشاف کیا ہے کہ صدر یحییٰ اور عوامی لیگ کے سربراہ کے درمیان پہلی بات چیت میں چھ نکات پر تبادلۂ خیال ہوا۔ اس پر صدر یحییٰ نے اپنی رائے پیش کی اور شیخ صاحب کو مغربی پاکستان میں چھ نکات کے بارے میں اکثریت کے ردِعمل سے باخبر کیا۔ اس موقع پر شیخ مجیب نے اپنا موقف واضح کرتے ہوئے کہا کہ وہ مذکورہ نکات میں ترمیم نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس بارے میں اپنی طرف سے کوئی فیصلہ عوامی لیگ پر ٹھونس سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ آئندہ ملاقات میں ان رہنماؤں کو بھی شامل کر لیا جائے۔ جو اپنی جماعت میں نمایاں اور اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں چھ نکات پر تفصیلی گفتگو ہو جائے شاید کوئی مناسب فارمولا یا تجویز سامنے آسکے تاکہ منتقلیٔ اقتدار سے پہلے اہم معاملات ملک گیر سطح پر طے ہو جائیں۔

مبصرین کی رائے ہے کہ صدر یحییٰ اور شیخ مجیب اور ان کے ساتھی چھ نکات پر ایک ایسی تجویز پر متفق

چھ نکات کے بارے میں ایک متفقہ فارمولا تیار ہو گیا ہے

مرکز میں عوامی لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت قائم ہوگی

ہو گئے ہیں جو مغربی پاکستان کے باقی چار صوبوں کے لئے بھی قابلِ قبول ہو گی۔ یہ تجویز صدر یحییٰ اور جناب بھٹو کی لاڑکانہ میں ملاقات کے دوران زیرِ بحث آئے گی۔ اور امکان اس بات کا ہے کہ مسٹر بھٹو اس تجویز یا فارمولے کو منظور کر لیں گے۔

مبصرین کے مطابق یہ تجویز مرکزی حکومت کے اختیارات اور بالخصوص صوبوں سے ٹیکسوں کی وصولی کے بارے میں ہے۔ مرکز کے اخراجات یعنی دفاع اور امورِ خارجہ کی ضروریات پورا کرنے کے لئے صوبوں سے ٹیکس کس طرح لیا جائے گا۔ شیخ مجیب نے اس ضمن میں چھ نکات کے اندر رہتے ہوئے مرکز کے مفادات کو مکمل تحفظ دینے پر اظہارِ رضامندی کر دیا ہے۔ مرکز کو اس قدر ٹیکسوں سے آمدنی ہو جائے گی کہ وہ ملک کے دفاعی اور دوسرے شعبوں کے اخراجات پورے کر سکے تاہم آئین کی بنیاد چھ نکات پر ہو گی جن کی توضیحات ملک کے دونوں حصوں کے عوام کے لئے قابلِ قبول ہوں گی۔

مبصرین نے انکشاف کیا ہے کہ مسٹر بھٹو نے یہ تجویز منظور کر لی تو ملک کے آئندہ صدر کا نام ذوالفقار علی بھٹو ہوگا قومی اسمبلی صدر یحییٰ کی خدمات کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے انہیں ملک کی تینوں افواج کا سپریم کمانڈر مقرر کرے گی۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ اسمبلی صدر یحییٰ کو فیلڈ مارشل کا اعزاز بھی دے دے گی اور وہ اپنے وعدے کے مطابق اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے سپرد کر کے ایک فوجی کی حیثیت سے فرائض انجام دیں گے۔

مبصرین کی رائے میں مسٹر بھٹو اور شیخ مجیب الرحمان کے درمیان آئین سازی اور دوسرے امور پر اتفاقِ رائے کے بعد مرکز میں عوامی لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت قائم ہو گی، وزارتِ عظمیٰ، وزارتِ خارجہ اور وزارتِ دفاع عوامی لیگ کے پاس ہوں گے۔ مرکزی حکومت میں بھی تین وزارتیں اہم ہوں گی عوامی لیگ اس بات پر رضامند ہو جائے گی کہ بعض وزارتیں پاکستان پیپلز پارٹی کو دے دی جائیں۔

مبصرین کا خیال ہے کہ صدر یحییٰ چاہتے ہیں کہ اسمبلی کے اجلاس کے انعقاد سے قبل وہ تمام باتیں طے ہو جائیں جو آئین سازی یا منتقلیٔ اقتدار کی راہ میں رکاوٹ کا موجب بن سکتی ہیں۔ اس کے لئے عوامی لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنماؤں میں ایسے تمام امور پر مفاہمت ہونا ضروری ہے۔

مبصرین ڈھاکہ میں صدر یحییٰ اور عوامی لیگ کے رہنماؤں کے طویل مذاکرات کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ صدر یحییٰ کو عوامی لیگ کی حد تک توقع سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ان کی رائے ہے کہ صدر یحییٰ کو مسٹر بھٹو سے بات چیت کے دوران اس سے بھی زیادہ کامیابی حاصل ہو گی اور اس کے بعد مسٹر بھٹو اور شیخ مجیب الرحمان کے درمیان انہی ملاقاتوں کے نتائج کے پیشِ نظر بات چیت ہو گی جو اطمینان بخش رہے گی اور دونوں پارٹیوں کے رہنما آئندہ حکومت کی تشکیل کے بارے میں متفقہ فارمولا تیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

آئین میں ملک کے دونوں حصوں کے صوبوں کو یکساں اختیارات حاصل ہوں گے اور انہیں بہت زیادہ خود مختاری مل جائے گی۔ ہر صوبے کے اخراجات اور آمدنی کے حسابات الگ رکھے جائیں گے اور ان کی نگرانی اسٹیٹ بنک آف پاکستان کرے گا۔ اردو اور بنگالی کی قومی زبانوں کی حیثیت برقرار رہے گی تاہم ہر صوبے کی سرکاری زبان علاقائی ہو گی۔

مستقبل کے اسپیکر اور وزراء کے نام

- الفتح کی اطلاعات کے مطابق قومی اسمبلی کے آئندہ اسپیکر عوامی لیگ کے رہنما خوندکر مشتاق احمد ہوں گے۔
- ملک کے آئندہ وزیرِ خارجہ ڈاکٹر کمال حسین (عوامی لیگ) ہوں گے۔
- مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کے وزیرِ اعلیٰ کا قلمدان کیپٹن منصور علی (عوامی لیگ) کو ملے گا۔

قطعہ

—— شہلا

شور ہے ہر طرف اُجالوں کا
زندگی دار پہ چمکتی ہے
چاند نکلا ہے بے گناہی کا
درِ زنداں پہ چھوٹ پڑتی ہے

الفتح

مسٹر بھٹو! سازشوں سے خبردار

محمود شام



اسلام پسندوں اور بیوروکریسی کے خطرناک منصوبے

پروگریسو پیپرز لمیٹڈ سے نکالے جا ہوئے کارکنوں کے لئے صحافیوں نے جو بھوک ہڑتال کی تھی، اس میں پاکستان پیپلز پارٹی کے قومی اور صوبائی اسمبلی کے منتخب ارکان نے بھی شرکت کی تھی، عوام میں ان صحافیوں اور بھوک ہڑتالیوں کے لئے اس قدر جذبہ بڑھا اور ہنگامہ اس قدر شدید ہوا کہ لاہور کے نظم و نسق میں پولیس کی مدد کے لئے فوج بھی طلب کر لی گئی۔ یہ بھوک ہڑتال ایسے مرحلے پر جاکر ختم ہوئی جسے کامیاب نہیں کہا جا سکتا کیونکہ نہ تو پی پی ایل میں ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوا اور نہ نیشنل پریس ٹرسٹ کو توڑا گیا۔ صرف حال ہی میں برطرف ہونے والے کارکنوں کو واپس لیا گیا وہ بھی مشروط طور پر۔ اور گرفتار شدگان کو رہا کر دیا گیا۔ اسی بڑی تحریک جس میں عوام کے منتخب نمائندے بھی بھوک ہڑتال پر چلے گئے۔ اس کا یہ حاصل خاصا افسوسناک ہے۔

اس بھوک ہڑتال اور اس کے عوامل پر تو کہیں الگ بات کی جائے گی۔ یہاں ہمیں ایک ایسی سیاسی پارٹی کے کردار پر کچھ کھلی کھلی باتیں کرنی ہیں، جو اس احتجاج میں مکمل طور پر شریک ہو گئی تھی۔ اور یہ اس شہر کا واقعہ ہے جو اس صوبے کا دارالحکومت ہے یہاں یہ پارٹی حیران کن اکثریت سے کامیاب ہوئی ہے۔ وہاں پارٹی کے منتخب ارکان اسمبلی کا احتجاج میں اس طرح شریک ہو جانا اور مقاصد حاصل کئے بغیر بھوک ہڑتال کا ختم ہو جانا سیاسی عمل میں بے پناہ خامیوں کا مظہر ہے۔

ایک سیاسی المیہ

اس سیاسی المیے کا جذبات سے ہٹ کر تجزیہ نہایت ضروری ہے۔ مسٹر بھٹو کے راولپنڈی کی پریس کانفرنس میں اپنے بھوک ہڑتالی ارکانِ اسمبلی کے بارے میں جو باتیں کیں اور جو لہجہ اختیار کیا، وہ اگرچہ ہمارے نزدیک نیک نیتی پر مبنی ہے لیکن اس کا اندازہ کچھ ایسا تھا کہ اس پر دائیں بازو کے اخبارات کو بغلیں جھانکنے کا موقع ملا۔ اسی طرح پنجاب میں اس مسئلے پر پارٹی کے اندر دو عملی کا رجحان بھی نظر آیا، جس کی طرف بعض اخبارات نے بھی اشارہ کیا۔ انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی کی یہ پہلی سیاسی آزمائش تھی۔ جس میں پارٹی جذباتی طور پر تو کامیاب رہی لیکن سیاسی طور پر نہیں۔

عبدالحفیظ کاردار بھوک ہڑتال کا اعلان شاید جنوری کے اوائل میں کر چکے تھے، اور ۷ جنوری سے انہوں نے بھوک ہڑتال شروع بھی کر دی۔ بھٹو صاحب نے پنڈی میں پریس کانفرنس ۱۳ جنوری کو کی۔ اس سے پہلے وہ لاہور سے گزرے بھی تھے۔ اس مسئلے پر بات چیت شروع میں ہی ہو جانی چاہیئے تھی۔ پارٹی ڈسپلن کا تقاضا یہ تھا کہ پارٹی کا کوئی عام رکن یا رکن اسمبلی اگر بھوک ہڑتال جیسا انتہائی قدم اٹھانا چاہتا ہے، اسے پارٹی کی ہائی کمان سے مشورہ ضرور کرنا چاہیئے، پارٹی پارٹی کا ہر رکن کسی بھی سیاسی اقدام کے لئے پارٹی کے نظم و ضبط کا پابند ہوتا ہے۔ اس سارے ہنگامے میں یہی نظر آتا ہے کہ اس سطح پر کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔ مسٹر بھٹو کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہم اب حزبِ اختلاف میں نہیں ہیں جو ایجی ٹیشن کرتے پھریں۔ پی پی ایل کا مسئلہ معمولی مسئلہ بھی نہیں ہے۔ اس لئے پارٹی کے ارکان کو چاہیئے تھا کہ پارٹی سطح پر باقاعدہ فیصلہ کرنے کے بعد حکومتِ پنجاب کو مجبور کرتے کہ وہ عوام کی مرضی کے مطابق کوئی قدم اٹھاتی۔ حکومت بھی ان کی ہدایت ماننے کی پابند ہے۔ کیونکہ عوام نے اپنی باگ ڈور ان نمائندوں کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ حکومت کو بھی چاہیئے کہ اپنے فیصلوں میں ان کو شریک کرے۔ پی پی ایل کے سلسلے میں پیپلز پارٹی نے تنظیمی فقدان کا مظاہرہ کیا ہے۔

عوامی مسائل کا سیلاب

ایک طرف پیپلز پارٹی کا یہ تنظیمی فقدان ہے، دوسری طرف عوامی مسائل اور توقعات کا سیلاب ہے۔ ماضی اور دوسرے ملکوں کی تاریخ کی روشنی میں عوام قدرتی طور پر یہ توقع کر بیٹھے ہیں کہ وہ اپنے نمائندے منتخب کر چکے ہیں اس لئے اب مسائل حل ہو جانے چاہئیں۔ غیر شعوری طور پر ایک خواہش یہ بھی ہے کہ یہ نمائندے حکومت

اقتدار کی منتقلی تک عوام کیا کھائیں، کیا پہنیں ———؟

سنبھال لیں اور ان کے مسائل حل کرنے شروع کر دیں۔ لیکن پاکستان کی تاریخ اس وقت جس مرحلے پر ہے، وہ دوسری دنیا سے قطعی مختلف ہے۔ نمائندے منتخب ہو چکے ہیں مگر وہ پہلے دستور بنائیں گے اور پھر انہیں اقتدار منتقل ہوگا۔ اس وقت تک یہ نمائندے بے بس ہیں۔ موجودہ حکومت مسائل حل کرنے کی تو اہل نہیں ہے مگر مسائل بڑھتے جا رہے ہیں۔ حکومت کی مشینری کی کارروائیوں سے مسائل پھیلتے جا رہے ہیں۔

گذشتہ دنوں ملک میں جو ہنگامے ہوئے، انہوں نے صورتِ حال کو انتہائی سنگین بنا دیا ہے۔ یہ ہنگامے مشرقی پاکستان میں نہیں ہوئے، مغربی پاکستان میں ہوئے ہیں۔ مغربی پاکستان میں بھی ان صوبوں میں جہاں پیپلز پارٹی اکثریت سے جیتی ہے۔ کراچی، حیدرآباد، نواب شاہ، ملتان، لاہور میں یہ ہنگامے اگرچہ عوام میں اضطراب کی غمازی کرتے ہیں، لیکن ان کے پیچھے بہت بڑی سازشیں ہیں۔ یہ سازشیں اس لئے کی جا رہی ہیں کہ عوامی نمائندوں کو اقتدار منتقل نہ ہو سکے۔ اس لئے ہم پاکستان پیپلز پارٹی سربراہ جناب بھٹو سے گذارش کر رہے ہیں کہ وہ سازشوں سے خبردار رہیں۔ وہ مسائل کے حل کے لئے عوام کو اقتدار کی منتقلی تک انتظار کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ لیکن منتقلیٔ اقتدار کا مرحلہ آنے سے پہلے پہلے مسائل اس قدر سنگین صورت اختیار کر رہے ہیں کہ صبر اور انتظار بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

بیوروکریسی کی سازشیں

مشرقی پاکستان میں ہنگامے نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی بیوروکریسی بھی قوم پرست ہے اور وہ مجیب کے ساتھ ہے، مجیب کی اس قدر بھاری اکثریت سے کامیابی کی وجہ بھی بیوروکریسی کی حمایت ہے، بتانے والے تو یہ بھی بتاتے ہیں کہ گذشتہ ڈیڑھ دو برس سے بیوروکریسی پر مجیب صاحب کو کنٹرول حاصل تھا۔ اور حکومت کے پاس پہنچنے سے پہلے مجیب صاحب کو فائلیں پہنچ جاتی تھیں۔ بیوروکریسی کے مفادات چونکہ اب مجیب سے وابستہ ہیں، اسی لئے وہاں ایسا کوئی ہنگامہ نہیں ہو سکا ہے۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان میں بیوروکریسی عوامی طاقتوں کی سخت مخالف ہے۔ بیوروکریسی کی مداخلت کے باعث بلوچستان میں پیپلز پارٹی انتشار کا شکار ہو گئی اور سرحد میں انتخابات میں ناکامی کی سب سے بڑی وجہ بیوروکریسی کی مخالفت ہے۔ پنجاب میں بیوروکریسی عوامی سیلاب کے سامنے کچھ نہ کر سکی اور اب ہنگامے



ایک راہگیر جو ہنگاموں کے دوران پولیس کے ہتھے چڑھ گیا

موجودہ حکومت مسائل حل نہیں کر سکتی تو مسائل پیدا بھی نہ کرے

کروا رہی ہے۔ سندھ میں بیوروکریسی نے ڈٹ کر پیپلز پارٹی کی مخالفت کی۔

پٹرول پر ٹیکس

قیمتوں میں اضافہ اور روز افزوں مہنگائی بیوروکریسی اور سرمایہ داروں کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہے۔ اس طرح اقتصادی بحران پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، لوگوں نے اسے مجبوراً برداشت کیا تو اچانک پٹرول پر ٹیکس عاید کر دیا گیا۔ یہ اتنی بڑی سازش اور سوچا سمجھا منصوبہ تھا کہ اس سے پوری سیاسی اور معاشرتی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی۔ رکشے اور ٹیکسی کی ہڑتال نے سخت بحران پیدا کیا تادمِ تحریر یہ ہڑتال جاری ہے۔ اور اب پٹرول کے ڈیلروں نے بھی ہڑتال کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس میں نہ رکشے ٹیکسی والوں کا قصور ہے، نہ پٹرول ڈیلروں کا، اور نہ عوام کا۔ سب کے سب پریشانی میں مبتلا ہیں۔ پٹرول بھی اگر بند ہو گیا تو اس سے سارا کاروبار اور زندگی مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔ یہ صریحاً بیوروکریسی کی سازش ہے۔ ورنہ اس وقت پٹرول پر ٹیکس کا کوئی جواز نہ تھا۔ متعلقہ سرکاری افسروں نے پوری طرح سوچ سمجھ کر وہ قدم اٹھایا ہے جس سے معاشرے کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔

آمدنی پر سرچارج صرف مغربی پاکستان میں

اس سے پہلے آمدنی پر جو سرچارج عاید کیا گیا ہے وہ صرف مغربی پاکستان میں کیا گیا ہے اس طرح مشرقی اور مغربی پاکستان میں دوگونہ نفرت پیدا کرنے کی سازش کی گئی ہے، مغربی پاکستان والے اس آگ میں جلیں کہ مغربی پاکستان

میں جلیں کہ مشرقی پاکستان والوں پر ٹیکس عاید نہیں کیا گیا اور مشرقی پاکستان والے اس آگ میں جلیں کہ مغربی پاکستان والوں کی آمدنی اس قدر زیادہ ہے کہ ان پر مزید سرچارج لگایا گیا ہے۔ یہ فاصلے کس نے پیدا کئے ہیں۔

اسلام پسند اور بیوروکریٹوں کا گٹھ جوڑ

شکست خوردہ اسلام پسند سیاسی جماعتیں اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے طرح طرح ہنگامے کھڑے کر رہی ہیں، ایک سازش کا ذکر ہم گذشتہ بار کر چکے ہیں۔ دلآزار کتاب کی اشاعت کے خلاف ہنگاموں کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ حالانکہ کتاب پر پابندی عاید کی جا چکی ہے۔ ان ہنگاموں کے سلسلے میں بیوروکریسی نے کھلی چھوٹ دی۔



پولیس والوں کی زد میں آیا ہوا کوئی شخص پٹنے سے محفوظ نہیں رہ سکتا

سرکاری افسروں اور پولیس نے املاک کی تباہی کا نقشہ دیکھا۔ عوام دشمن اخبارات نے ان ہنگاموں کو مذہبی رنگ دے کر خوب ہوا دی۔ اسلام پسند جماعتیں مشرقی پاکستان میں بھی موجود ہیں وہاں کے لوگوں کو بھی ناموس رسولؐ کا اتنا ہی خیال ہے، وہاں ایسا کیوں نہیں ہوا۔ وہاں اسلام پسند قوتیں مجیب الرحمان کو اپنی حمایت کا یقین دلا رہی ہیں، صرف مغربی پاکستان میں ہنگامے کرکے وہ مجیب کو ان کے ہاتھ مضبوط کرنے کا احساس دلا رہی ہیں۔ ہڑتال بھی سازشوں کے اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ورنہ اس ہڑتال کا فوری سبب کچھ نہ تھا۔ یہ ہڑتال مشرقی پاکستان میں کیوں نہیں ہوئی۔ یہ بھی اسلام پسندوں کی سازشوں کا مظہر ہے۔

سندھی اردو کا مسئلہ

اب سندھی اور اردو کا مسئلہ بھی کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ایسے عبوری دور میں کسی بورڈ کے چیئرمین یا یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو ایسے فیصلے کا کوئی اختیار نہیں ہونا چاہیے ایسے نازک اور عبوری دور میں جان بوجھ کر یہ مسئلہ پیدا کرکے ہنگاموں کا موقع دیا گیا ہے۔ یہ دعوت بھی بیوروکریسی کی طرف سے دی گئی۔

بائیں بازو کی بعض بغاوتی جماعتیں اور تنظیمیں بھی ان سازشوں میں برابر کی شریک ہیں۔ اور بائیں بازو کی نئی جماعت پیپلز پارٹی کا برسرِ اقتدار آنا برداشت نہیں کر سکتی ہیں۔

خود پیپلز پارٹی میں ایسے لوگ موجود ہیں، جو اپنے طور پر اقتدار کی ہوس میں ایسی سرگرمیاں کر رہے ہیں جو پارٹی کے مفادات کے خلاف جاتی ہیں۔ فی الوقت ان سازشوں کا انکشاف مناسب نہیں ہے۔ یہ افواہیں بھی ہیں کہ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو اراکان اسمبلی کے دھڑے بنا کر پارٹی کی ہائی کمان پر دباؤ ڈالنے کی فکر میں ہیں کہ صوبائی وزارتیں ان کے دھڑے کے سپرد کر دی جائیں ورنہ وہ اپنی اکثریت کے ساتھ پارٹی بدل لیں گے۔

تری زلف کے سر ہونے تک

یہ تمام سازشیں ہو رہی ہیں ہو سکتا ہے کہ پارٹی کی ہائی کمان کو ان کا علم بھی ہو، لیکن عوام ان سازشوں سے بے خبر ہیں۔ بلکہ وہ ان سازشوں کا شکار ہو کر پریشانی میں مبتلا ہیں۔ اقتدار منتقل ہونے میں کم از کم چار پانچ ماہ کا عرصہ لگے گا۔ لیکن بے روزگار اور غریب خاندان مہنگائی کا مقابلہ کیسے کریں۔ روزگار کہاں سے لائیں۔ روٹی کپڑا کہاں سے حاصل کریں۔ موجودہ حکومت عبوری حکومت ہے، وہ مسائل تو حل نہیں کر سکتی، لیکن دھڑا دھڑ مسائل پیدا کئے جا رہی ہے۔ سوچنے کی بات ہے جب اقتدار منتقل ہوگا۔ اس وقت تک (۱) عوامی مسائل کے بوجھ تلے دب کر بالکل بے جان ہو چکے ہوں گے (۲) بیوروکریسی اس قدر مسائل پیدا کر چکی ہوگی، کہ اقتدار کے باوجود انہیں فوراً حل کرنا پیپلز پارٹی کے بس کی بات نہیں ہوگی۔

نگران کمیٹیاں قائم کی جائیں

اب انتخابی سرگرمیاں ختم ہو چکی ہیں، اس لئے سب سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ پنجاب اور سندھ جہاں پیپلز پارٹی کی حکومتیں قائم ہونا ہیں، وہاں مسائل کے اعتبار سے ارکانِ اسمبلی، ماہرین اور پارٹی لیڈروں پر مشتمل مختلف کمیٹیاں قائم کی جائیں، جو ایک طرف تو مسائل کا مکمل جائزہ لیں۔ رپورٹیں تیار کریں۔ وسائلِ آمدنی دیکھیں، یہ بھی جائزہ لیں کہ یہ وسائل کیسے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ یہ کمیٹیاں ایک طرح کی عبوری وزارتیں ہوں گی۔ اور یہی کمیٹیاں بعد میں وزیروں مشاورتی کونسلوں کے طور پر کام کر سکتی ہیں۔

پنجاب اور سندھ، مسائل اور وسائل کے سرچشمے

یہ حقیقت ہے کہ سندھ اور پنجاب اس وقت مسائل کے گڑھ بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ وسائل بھی انہی دو صوبوں کے پاس ہیں۔ بھٹو صاحب کا یہ کہنا درست ہے کہ سندھ اور پنجاب قوت کے سرچشمے ہیں، لیکن اس وقت یہ مسائل کے سرچشمے بنے ہوئے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے دو بڑے وعدے ہیں۔ صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینا۔ زمینوں کی حد ملکیت مقرر کرنا۔ پاکستان کی تمام بڑی صنعتیں اور تمام بڑی زمینداریاں انہی دو صوبوں میں ہیں۔ اس لئے پارٹی کے منشور کا عملی مظاہرہ انہی دو

باقی صفحہ ۳۴ پر

ایک قیدی کا خط

ہم ظالموں سے اپنا بدلہ لیں گے

ہمارے گذشتہ سرورق پر مزدور رہنماؤں کی جو تصویر شائع ہوئی تھی- اس میں نوجوان مزدوروں کو بیڑیاں پہنے دیکھ کر بہت سے نرم دل کانپ اٹھے ہیں- لیکن وہ لوگ جو موجودہ سسکتے ہوئے نظام کو دھکا دینے کے لئے اپنا سب کچھ لٹانے کے لئے تیار ہیں- ان کے غیض و غضب کی چنگاریاں اور بڑھ گئی ہیں.

ہمارے یہ محترم مجرم جنہوں نے ہمیشہ مظلوم طبقوں کی سربلندی کے لئے جدوجہد کرنے والوں کو نئے حوصلے اور ولولے دیئے ہیں بیڑیاں پہن کر بھی بہت پرسکون ہیں- ان کی آنکھوں میں عزم و ہمت کی چمک ہے- لیکن اس کے ساتھ ان کے ہاتھوں اور پاؤں کی زنجیریں یہ جھنکار بھی دے رہی ہیں کہ ان بیڑیوں اور ہتھکڑیوں سے آزاد ہاتھ اور پاؤں والے جیالوں کے غیض و غضب کی چنگاریاں سرمایہ داری کے ناخداؤں پر کب آگ بن کر گریں گی؟"

بیڑیاں پہننے والے ان قیدیوں اور ان کے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کیا بیت رہی ہے- انسانیت سوزی اور ظلم و جبر کے کون کونسے امتحان ان سے لئے جا رہے ہیں- جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی یہ پولیس مزدوروں، کسانوں اور مظلوم طبقوں کے لئے لڑنے والوں پر کیا کیا ستم توڑ رہی ہے- یہ کوئی نئی کہانی نہیں ہے- سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ جب ان جیلوں کی دیواریں گریں گی تو ان کے ملبے میں ایسی نہ جانے کتنی داستانیں، اور ان داستانوں کے کرداروں کی گھٹی ہوئی چیخیں امڈ کر آئیں بھی آزاد ہوں گی-

یہ ایک قیدی کا خط ہے جو اس نے جیل میں ہونے والے مظالم کے بارے میں تحریر کیا ہے- یہ خط جیل کا ایک نمائندہ خط ہے جو اس نظام کے رکھوالوں کا ایک ہلکا سا خاکہ کھینچنے کے لئے کافی ہے- جیل سے ایک سیاسی قیدی نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ہم اس کی زبان میں شائع کر رہے ہیں-

"حبیب مل کے ایک مزدور کے کیس کی کورٹ میں تاریخ تھی- ۲۲ نومبر ۱۹۷۰ء ــــ اس کو اس سے پہلے بھی ایک تاریخ پہ کورٹ نہیں لے جایا گیا تھا ــــ اس کی محض وجہ یہ تھی، اپنے حق کے لئے لڑنے کے جرم میں قید ہونے والے اس مزدور نے مطلوبہ پیسے جیل کے لوگوں کو نہیں دیئے تھے- یامین اور میر تھیبو طالب علم رہنما سندھ اس سلسلے میں جیل کے افسران سے بات کرنے گئے- سپرنٹنڈنٹ نے یامین سے تلخ کلامی کی اور کمرے سے باہر نکالنے کی کوشش کی- جس کی وجہ سے وہ ہارٹ اٹیک میں مبتلا ہوا اور وہیں گر گیا اس کے بعد یامین کو اسپتال بھیج دیا گیا- اور میر تھیبو کو بند وارڈ بھیج دیا گیا- جس پہ چند قیدیوں پر مشتمل ایک وفد سپرنٹنڈنٹ سے ملنے گیا- لیکن انھوں نے ملنے سے انکار کر دیا- اس کے بعد تمام قیدیوں نے فیصلہ کیا کہ جیل کے اندر جتنی بھی بدعنوانیاں ہو رہی ہیں ان کی تحقیقات کے لئے حکام بالا کو مطلع کریں گے- یہ بات جب سپرنٹنڈنٹ تک پہنچی تو اس نے جیل بند ہونے کے بعد رات کو ساڑھے دس بجے ہمیں یہ کہہ کر آفس میں بلوایا کہ آپ لوگ آئیں ہم بات کر کے معاملہ طے کر لیں گے- عزیز- ریاض- خواجہ نجیب- اقبال- ڈاکٹر رشید کو بلوایا- جب ہم اندر پہنچے تو ہمیں دھکے دیئے گئے اور اس کے بعد دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی لگا کر لاک اپ اور مختلف مراحل سے گزر کر چار آدمیوں کو خیرپور اور ڈاکٹر رشید کو حیدرآباد جیل روانہ کر دیا۔

ہمیں اپنے کپڑے جوتے یا کسی قسم کا کوئی سامان لینے کی اجازت بھی نہیں دی گئی اور جاڑے میں اسی صورت سے ننگے پاؤں نکال دیا- جب ہم چار آدمی خیرپور جیل میں پہنچے تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل نے ہمیں اپنے کمرے میں بلا کر سب سے پہلے ہمیں چپلیں اتارنے کا حکم دیا- اور اس کے بعد انتہائی بھونڈے ...... انداز کی گالیاں دی گئیں- اس کے بعد وہ ہتھکڑی جو عموماً پھانسی لگنے والوں کو لگائی جاتی ہے ہمارے دونوں ہاتھوں میں لگائی گئی- اس کے بعد ہمیں بند وارڈ میں بند کر دیا گیا- جہاں پہ ہمیں ڈنڈا بیڑی بھی لگائی گئی اور ہمیں اکیلے اکیلے بند کر دیا گیا- اس دوران ہمیں رات کو سونے کے لئے صرف ایک کمبل اور پھر دو کمبل دیئے گئے- جو اتنی سردی میں ناکافی ہیں- یہ کمبل چھ بجے ہم سے چھین لئے جاتے تھے اور پھر صبح سے لے کر شام تک ہم اس ٹھنڈے فرش پر بیٹھے رہتے تھے- کھانے کے لئے ہمیں بند وارڈ کی سلاخوں کے باہر سے پانی پینے کے لئے منہ میں ٹپکایا جاتا تھا- اور تقریباً یہی انداز روٹی کا بھی تھا بیت الخلا کے لئے بھی اندر کمرے ہی کو استعمال کرنا پڑتا تھا- مسلسل ۱۵ دن تک یہ سلسلہ رہا- اس کے بعد ہم نے جیلروں وغیرہ کو بلوایا تاکہ اپنی حالت بتائیں لیکن انھوں نے سننے سے انکار کر دیا- ۱۵ دن کے بعد ہمیں یہ بتایا گیا کہ کراچی جیل سے یہ احکامات آئے تھے کہ ہم پر سختی کی جائے- جس میں لکھا تھا کہ ہمیں قید تنہائی میں رکھا جائے- آتے وقت پھر بھی ڈنڈا بیڑی پہنائی گئی-

لیکن ہماری ٹانگوں کو لوہے پہنا کر جکڑنے والے شاید ابھی اس سے واقف نہیں ہیں کہ ان قدموں میں منوں لوہا بھی ڈال دیا جائے تو بھی یہ صرف انقلاب کے راستوں پر چلنا نہ چھوڑیں گے- ان کی منزل انقلاب اور صرف انقلاب ہے- راہوں میں ایسی ہزاروں جیلوں اور سنگینوں سے گزرتے اور انہیں ڈھاتے ہوئے، ہم جب اپنی منزل پر پہنچیں گے تو ہم یہ بیڑیاں کسی کے پاؤں میں نہیں ظلم کے خداؤں کی گردنوں میں ڈالیں گے-"

(ایک قیدی)

الفتح

پی آئی اے کی ہڑتال خطرناک سازش کا نتیجہ تھی

نمائندہ الفتح

آخر پیاسی اور درانی صاحب میں ٹھن ہی گئی۔

ہم نے حضور کو نیک و بد بہت سمجھایا لیکن اس وقت انتظامیہ پیاسی سے اپنی محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھی، بڑھتی رہیں۔ مجید صابر شیخ اور حافظ اقبال درانی صاحب کے پروٹوکول بنتے رہے۔ اور اپنے مزدوروں پر رعب ڈالتے رہے کہ ہم تمہارے مطالبات منوا رہے ہیں درانی صاحب ہماری مٹھی میں ہیں، اپنے نیوز بلیٹنوں میں جعلی اور کاغذی وعدے کر کر کے کارکنوں کو اندھیرے میں رکھتے رہے۔ لیکن مزدوروں میں بے چینی پھیلتی رہی مزدور یونین کے چھوٹے عہدیداروں کے گریبان بھی پکڑنے لگے۔ لیکن وہ کیا جواب دے سکتے تھے کیونکہ پیاسی کی ہائی کمان تو انہیں اعتماد میں نہیں لیتی تھی۔

ہم نے اس وقت بھی پی۔ آئی۔ اے کی انتظامیہ کے گوش گزار کیا تھا کہ پیاسی مزدوروں کی نمائندہ یونین نہیں ہے اسے گائیڈ لائن کہیں اور سے ملتی ہے۔ ہم نے بتایا تھا کہ مجید صابر شیخ گجرات میں جماعتِ اسلامی کے اجتماعات سے خطاب کرتے ہیں۔ مولانا مودودی سے ملتے ہیں پروفیسر غلام اعظم امیر جماعتِ اسلامی مشرقی پاکستان کا کراچی ایئرپورٹ پر استقبال کرتے ہیں۔ کنیز فاطمہ اور نیپ بھاشانی کے کارکنوں پر گملے برساتے ہیں۔ بیان دیتے ہیں کہ ہم نے سوشلسٹوں کو پی آئی اے سے نکالا ہے اب ملک سے نکالیں گے۔ یہ کرتوت کسی مزدور یونین کے نہیں ہوتے۔ اسی دوران میں انجینئروں اور پائلٹوں کے اختلافات بڑھے۔ پیاسی کے دور میں پی آئی اے کے طیاروں کو اندرون ملک زیادہ حادثوں سے دوچار ہونا پڑا۔ پی۔ آئی۔ اے کی کارکردگی واضح طور پر متاثر ہوئی۔ پیاسی نے ایئرپورٹ سے ہٹ کر کراچی کی انتظامیہ پر بھی دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ کراچی کے ڈپٹی کمشنر کنور ادریس کے پیچھے پڑ گئے۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن انتظامیہ۔ پیاسی نوازی پر تلی رہی۔ پھر جب پی۔ آئی۔ اے کی ساکھ گرنے لگی۔ اور خود انتظامیہ پیاسی کے لاڈلے بچے کی حرکتوں سے تنگ آ گئی۔ خود درانی صاحب اور انکے دوستوں کی نوکریاں خطرے میں پڑنے لگیں تو انہیں اپنے فرض کا خیال آیا۔ ادھر پی۔ آئی۔ اے کے مزدوروں نے بھی یونین کا دم ناک میں کر دیا کیونکہ یونین کے تمام وعدے کھوکھلے نکل رہے تھے۔ پیاسی کے عہدیداروں نے اپنی یونین کی ساکھ بچانے اور جماعت اسلامی نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے منصوبہ بنایا کہ پی۔ آئی اے میں ہڑتال کروا دی جائے تاکہ پورا انتظام معطل ہو کر رہ جائے پھر اپنی من مانی کارروائی کی جائے، یوں جماعت کی قوت کا مظاہرہ بھی ہو جائے گا اور پی آئی اے کے پیاسی سے بددل ہوتے مزدور بھی اعتماد میں آ جائیں گے۔ لیکن مسئلہ درپیش یہ ہوا کہ پیاسی کے لیڈروں کو یہ اعتماد نہیں تھا کہ وہ ۱۲ روز سے پہلے ہڑتال کی دعوت دیں تو تمام مزدور ہڑتال پر چلے جائیں۔ اس لئے ان کا سارا منصوبہ ہی ناکام ہو جاتا۔ انہوں نے صرف ایک روز پہلے سے یہ دھمکیاں دینی شروع کیں۔ پی۔ آئی۔ اے کے ملازمین کو اطلاع نہیں تھی کہ کل کیا ہوگا۔ رات ڈیڑھ بجے کے قریب پیاسی کے تین عہدیداروں نے جماعت اسلامی کے عہدیداروں سے مشورہ کر کے ہڑتال کا اعلان کر دیا اس وقت کوئی جنرل باڈی کا اجلاس نہیں بلایا گیا تھا۔ پی۔ آئی۔ اے کے ملازمین کی اکثریت کو اس ہڑتال کا علم اخبارات سے ہوا۔ یہ ہڑتال جو پہلے دو تین روز کامیاب ہوئی۔ وہ پیاسی کی پالیسی کی بجائے خطرناک سازش کا نتیجہ تھی۔ موٹر ٹرانسپورٹ میں پیاسی کے زیادہ "جیالے" ورکر موجود ہیں۔ سانحہ ایئرپورٹ میں ماخوذ فیروز پونا کا بھی اس شعبے سے تعلق ہے۔ ڈیڑھ بجے کے بعد ڈرائیوروں کی جو شفٹ پی۔ آئی۔ اے کے عملے کو گھروں سے لانے والی تھی۔ انہیں روک لیا گیا۔ کچھ تو ٹیکسی رکشے ہڑتال کی وجہ سے اور ویسے بھی۔ پی۔ آئی۔ اے کے ۸۰ فیصد سے زیادہ عملہ پی۔ آئی۔ اے کی ٹرانسپورٹ پر انحصار رکھتا ہے۔ اس طرح ہزاروں افراد جو آنا بھی چاہتے تھے۔ ڈیوٹی پر نہ پہنچ سکے۔ وہ گھروں پر گاڑیوں کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن گاڑیاں نہ پہنچیں اور یوں پہلی صبح ہڑتال کامیاب ہو گئی۔

اس طرح اچانک ہڑتال کا "فوری سبب" کیا تھا؟ کیونکہ جن ۲ ملازمین کی برطرفی کے خلاف احتجاج کیا گیا ہے۔ ان کی برطرفی کو ایک عرصہ ہو چکا ہے اس کے علاوہ بھی کوئی فوری وجہ نہ تھی بلکہ ولا تنار کتاب کے خلاف ہنگاموں پھر رکشہ ٹیکسی سے پیدا صورت حال کو جاری رکھنے کے لئے پی۔ آئی۔ اے میں ہڑتال کر دی گئی۔ اور یوں عوام کو جان بوجھ کر پریشانیوں میں مبتلا کیا گیا۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں ہم اس ہڑتال کو "سیاسی ہڑتال" کہنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ اس کے ساتھ ہی

نوکری جاتی

دیکھ کر

درانی صاحب

کو اپنے فرائض

کا خیال

آگیا

پیاسی اور انتظامیہ کے درمیان گٹھ جوڑ ختم ہوگیا

جماعت اسلامی کی ذیلی مزدور تنظیمیں نیشنل لیبر فیڈریشن، کے ای ایس سی یونین اور کے۔ ڈی۔ اے میدان میں اتر آئی اور پانی بجلی بند کرنے کی دھمکی دے چکی ہیں۔ جمعیت علمائے پاکستان اپنی مصالحتی کوششوں کا ڈھونگ رچا چکی ہے جماعت اسلامی کے لیڈر اپنے بیان داغ چکے ہیں۔

پیاسی اپنا کردار ادا کر چکی ہے۔ یہ ایک سال جو اس نے جماعت اسلامی کے اخبارات اور پی۔ آئی اے، کی انتظامیہ کی بیساکھیوں پر گزارا۔ اپنے انجام کو پہنچا۔ مزدوروں کی اکثریت کا اب اس پر سے اعتماد اٹھ چکا ہے۔ پیاسی کے لیڈر ٹولے کے کارنامے ان مزدوروں کے سامنے آچکے ہیں۔ پیاسی کے تین سرکردہ عہدیداروں کو کراچی ایئرپورٹ پولیس نے ڈاکہ زنی کے الزام میں پکڑا ہے۔ انہوں نے دو راہگیروں کو ٹیکسی میں بٹھا کر میمن گوٹھ کے قریب جا کر لوٹ لیا تھا۔ ان میں پیاسی کے ایک جائنٹ سیکرٹری اکرام بھٹی بھی شامل ہیں۔ کراچی ایئرپورٹ تھانے کے پاس ایسے بہت سے کیس درج ہیں کہ پیاسی کے رکن ڈرائیوروں یا لوڈرس نے کوئی خلاف قانون حرکت کی، پولیس نے ان سے پوچھ کچھ کرنا چاہی مگر پیاسی کے لیڈروں نے مزاحمت کی اور ہمیشہ ان قانون شکن افراد کو احتساب سے محفوظ رکھا۔

پیاسی کے لیڈروں کا رویہ پی۔ آئی۔ اے کے دفتروں میں کچھ اس قسم کا تھا۔ جیسے تمام اختیارات انہیں حاصل ہو گئے ہیں۔ کوئی افسر بھی پیاسی کے کسی رکن کی نظم و ضبط کے خلاف حرکت پر باز پرس کرتا تو فوراً درانی صاحب سے کہا جاتا کہ یہ کمیونسٹ ہے۔ اسے پی۔ آئی۔ اے سے نکالا جائے۔ مختلف شعبوں میں پہنچ کر سیکرٹری اور صدر صاحب رعب ڈالتے کہ یہ کام ایسے نہ ہوا تو آپ کا تبادلہ کروا دیا جائے گا۔ پی۔ آئی اے کی انتظامیہ نے شروع شروع میں بہت سے افراد کے تبادلے پیاسی کے لیڈروں کے اشارے پر کیے۔

مخالف یونین کے بے شمار افراد کو اس بنا پر برطرف کروایا گیا کہ وہ پیاسی کے رکن نہیں تھے۔ لیکن اب انتظامیہ نے دو افراد کو ان کی نظم و ضبط کے خلاف

ہڑتال ختم کرانے کے لئے چور دروازوں کی تلاش ہے

سرگرمیوں پر برطرف کیا تو پیاسی نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ پیاسی کے ارکان۔ اپنے لیڈروں سے پہلے ہی بددل ہو چکے ہیں۔ پیاسی اور انتظامیہ کا گٹھ جوڑ بھی ختم ہوگیا۔ اب پیاسی اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لئے مرتی کیا نہ کرتی۔ لیکن بیداری عوام کے اس دور میں یہ سازش کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس وقت جب یہ سطور لکھی جارہی ہیں۔ پیاسی کے لیڈر جو ہڑتال کروانے میں پیش پیش تھے اب کسی طرح ہڑتال ختم کروانے کے لئے چور دروازے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ جمعیت علمائے پاکستان کو درمیان میں اس لئے ڈالا کہ جماعت اسلامی کے بیچ میں آنے سے معاملہ فوراً کھل جاتا۔ پھر جمعیت علمائے پاکستان کے پاس ارکان اسمبلی زیادہ تعداد میں ہیں۔ صوبائی اور قومی اسمبلی کے ارکان سے پیاسی کے لیڈروں کو یہ امید تھی کہ معاملہ کسی طرح طے ہو جائے گا۔ جان چھٹ جائے گی، لیکن کچھ نہ بنا۔ انتظامیہ کو طرح طرح کے پیغام بھجوائے گئے کہ ہم سے مذاکرات کا ڈھونگ رچا لیں طے کچھ نہ کریں۔ ہم ہڑتال ختم کرنے کو تیار ہیں ابھی یہ پیغامات جارہے ہیں۔ اور ہمارا پرچہ پریس میں جارہا ہے۔ دیکھئے انتظامیہ کا بت کا فرماتا ہے یا نہیں!۔

پی آئی اے کے تمام برطرف شدہ ملازمین کو بحال کیا جائے

مزدور رہنما کا مطالبہ

مسٹر نبی احمد جنرل سیکرٹری ویسٹ پاکستان ورکرز فیڈریشن نے ایک اخباری بیان میں پی۔ آئی اے کی موجودہ صورت حال پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پی۔ آئی۔ اے کی انتظامیہ سے مطالبہ کیا ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ سال کے ایئرویز ایمپلائز یونین کے جن ستر ارکان کو پیاسی کے اشارے پر ملازمتوں سے برطرف کیا گیا ہے انہیں بحال کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی پیاسی کے بیس برطرف شدہ ارکان کو بھی ملازمت پر واپس لیا جائے

انہوں نے کہا ہے کہ پی۔ آئی۔ اے جیسے اہم ادارے کے لئے مستحکم صنعتی پالیسی وضع کی جائے تاکہ کارکنوں اپنی ملازمت سے بے فکر ہو کر اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دے سکیں مسٹر نبی احمد نے کہا ہے کہ اگر پی آئی اے کی انتظامیہ نے برطرف شدہ کارکنوں کو بحال نہیں کیا تو اندیشہ ہے کہ اس ادارے کا صنعتی امن دوبارہ خطرے میں پڑ جائے۔

دولت مشترکہ کی کانفرنس

بھان متی کے اس کنبے میں مسئلہ کشمیر خارج از بحث قرار دے دیا گیا

: عباس رضوی :

دولت مشترکہ کی سترھویں کانفرنس نے، جو ان دنوں سنگاپور میں ہو رہی ہے، عالمی اہمیت کے مسائل پر بحث مکمل کر کے اپنے اجلاس کو پیر تک کے لئے ملتوی کر دیا ہے۔ (یہ سطور اتوار کو لکھی جا رہی ہیں) کانفرنس کے حالیہ اجلاس میں جب پاکستانی نمائندہ، جناب احسان الحق نے کشمیر کے مسئلہ کو زیر بحث لانے کی "جسارت" کی تو انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا گیا کہ کشمیر کا مسئلہ پاکستان اور بھارت کا "نجی مسئلہ" ہے اور دولت مشترکہ کی روایت کی رو سے اس کے اجلاس میں "نجی نوعیت کے جھگڑے" بحث میں نہیں لائے جا سکتے۔

کشمیری عوام کی جدوجہدِ آزادی کے بارے میں دولت مشترکہ کی حالیہ کانفرنس کی سرد مہری ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں کیونکہ دولتِ مشترکہ کی اصلیت سے ہم پوری طرح واقف ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ دولتِ مشترکہ دراصل برطانوی نوآبادیاتی راج کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ دولتِ مشترکہ کسی ایسے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کیوں کرنے لگی جو کہ برطانوی نوآبادیاتی راج کا پیدا کردہ ہے۔ تعجب تو ہمیں اس بات پر ہے کہ جناب احسان الحق نے دولتِ مشترکہ کی کانفرنس میں کشمیر کے مسئلہ کو اٹھانے کی کوشش کی۔ افسوس تو ہمیں اس بات پر ہے کہ جب وزیر موصوف کو نیچا اس ۔۔۔ کے خب کرایا گیا تو انہوں نے واقعی چپ سادھ لی۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وزیر موصوف نے خاموشی اختیار کر کے اور کانفرنس سے باقاعدہ طور پر علیحدگی نہ اختیار کر کے دولت مشترکہ کے اس موقف کو تسلیم کر لیا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ بھارت اور پاکستان کا نجی مسئلہ ہے اور یہ مسئلہ ایشیائی اور افریقی عوام کا مشترکہ مسئلہ نہیں۔ جناب احسان الحق کے اس فعل سے پاکستانی عوام کی غیرت و حمیت مجروح ہوئی سو ہوئی۔ ان اس فعل سے کشمیری عوام کے اس موقف کو بھی ضعف پہنچا ہے کہ کشمیری بذاتِ خود ایک علیحدہ اکائی ہے۔ ایک علیحدہ قومیت، اور ایشیاء اور افریقہ کی تمام قومیتوں کی طرح کشمیریوں کو بھی حق پہنچتا ہے کہ قومی حقِ خود اختیاری کا مطالبہ کریں۔ وہ اس جبری الحاق کو توڑ دیں جو کہ بھارت سرکار نے ان پر جبری طور پر مسلط کر رکھا ہے۔

ہم کسی طور سے بھی کشمیری عوام کی جدوجہدِ آزادی کو بھارت اور پاکستان کا نجی مسئلہ نہیں تصور کرتے۔ کشمیر کا مسئلہ بنیادی طور پر کشمیریوں کا مسئلہ ہے۔ اور یہ کسی صورت میں بھی ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی قومی آزادی کی تحریکوں سے مختلف نہیں۔

بھانمتی کے اس کنبے نے کشمیر کے مسئلے کو خارج از بحث قرار دے کر اور جنوبی افریقہ کو برطانوی اسلحہ کی فراہمی کو ضروری اور اہم قرار دے کر ہمارے اس موقف کی تائید کر دی ہے کہ دولت مشترکہ دراصل امریکی سامراج کی بی ٹیم ہے اور اس کے عزائم سیٹو اور سینٹو جیسی فوجی تنظیموں سے کسی طور بھی مختلف نہیں۔ اجلاس کے دوران جب جنوبی افریقہ کو برطانوی اسلحہ کی فراہمی کا مسئلہ زیر بحث لایا گیا تو حکومتِ برطانیہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ بحرِ ہند میں روس کی بحری قوت میں روز بہ روز اضافے کی سبب دولت مشترکہ کے تجارتی راستے مخدوش ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس خدشے کو دور کرنے کے لئے دولت مشترکہ کے ممالک کے لئے لازم ہو گیا ہے کہ تجارتی راستوں پر مسلح پہرے بٹھائے جائیں مزید برآں برطانیہ سمنٹس ٹاؤن معاہدہ کے تحت جنوبی افریقہ کی حکومت کو اسلحہ فراہم کرنے کا پابند بھی ہے۔

ہم حکومت برطانیہ کے اس موقف کو ایک خوبصورت بہانہ تصور کرتے ہیں۔ حکومتِ برطانیہ دراصل بحر ہند میں روسی فوجی بیڑے کی موجودگی کو آڑ بنا کر جنوبی افریقہ اور بحر ہند کے بعض جزیروں میں اپنے فوجی اڈے قائم کرنا چاہتی۔ تاکہ ایشیا اور افریقہ میں بڑھتے ہوئے عوامی سیلاب کے آگے بند باندھا جا سکے۔ لیکن وہ ایشیا اور افریقہ میں تیز ہوتے ہوئے عوامی سیلاب کے آگے بند باندھنے کے اقدامات میں تنہا نہیں۔ سیٹو جیسی بدنام زمانہ عوام دشمن فوجی تنظیم کا ممبر ملک آسٹریلیا دولت مشترکہ کے اس کنبہ میں براہِ راست موجود ہے۔ آسٹریلیا کی فوج اس وقت ویت نام میں امریکی فوجوں کے دوش بدوش ویت نامیوں کی قومی جنگ کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں تحریکِ آزادی کو روکنے کے لئے اینگلو امریکی سامراج کی اس مکروہ سازش میں دولت مشترکہ کی حالیہ کانفرنس میں شریک افرو ایشیائی حکومتیں بھی شامل ہیں یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان ممالک کی خارجہ حکمتِ عملی کو اگر ان کی داخلہ حکمتِ عملی کے آئینہ میں دیکھیں تو سرمایہ دارانہ سامراج نوازی اور عوام دشمنی کی چھاپ واضح طور پر نظر آتی ہے۔ دولت مشترکہ کے تمام رکن جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ طرزِ معیشت اور معاشرت کو اپنائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اگر مادرِ بطانیۂ برطانیہ کو اپنے یہاں فوجی اڈہ بنانے کی پیش کش کرتا یا کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان کا "نجی مسئلہ" قرار دے دیا جاتا ہے تو کسی کو تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔

سیاسی چمگادڑیں

اعداد و شمار کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی ہیں

مجید داؤ

کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق پچھلے دو ہفتوں سے "پسندوں" کے نام نہاد جرائد اور رسالے کے قلمکار یہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ پیپلز پارٹی کی جیت صرف اسلام پسندوں کی باہمی پھوٹ کا نتیجہ ہے، کیونکہ پنجاب میں پیپلز پارٹی نے صرف چالیس فی صد ووٹ حاصل کئے ہیں جبکہ ساٹھ فی صد ووٹ اسلام پسندوں میں تقسیم ہو گئے۔ جسارت، زندگی، مشرق، کوہستان، اور چٹان کے کالم ایسے اعداد و شمار شائع کر کے، پسندوں کی بدنما شکست کے دھبے مٹانے کی ناکام کوشش میں مصروف ہیں۔ وہ سیاسی چمگادڑیں جو آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہی اپنے ازلی بدبختی کے اندھیروں میں جا چھپی تھیں، اعداد و شمار کی انہی بیساکھیوں کے سہارے پھر سے میدانِ سیاست کا رخ کرنے لگی ہیں۔ اس مضمون میں اسلام پسندوں ہی کے ایک ہفت روزہ اخبارِ جہاں میں دیئے گئے اعداد و شمار کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ عوام کو اعداد و شمار کی بھول بھلیوں میں الجھانے والے ایک بار پھر آئینہ دیکھ سکیں۔ پورے مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کے حاصل کردہ

مجموعی ووٹ۔ ۶۰ لاکھ ۱۳ ہزار ۹ سو ۶۰۔

دیگر تمام مخالف جماعتوں کے بہ شمول آزاد امیدواران مجموعی ووٹ۔ ۸۹ لاکھ ۶۸ ہزار ۵ سو ۷۵۔

مؤخر الذکر ووٹوں میں آزاد امیدواروں کے مجموعی ووٹ ... ۱۶ لاکھ ۷۷ ہزار ۳ سو ۴۸۔

سیاسیات کے ضابطوں کے مطابق آزاد امیدواروں کے ووٹ نہ تو پیپلز پارٹی کے ووٹوں میں شمار ہو سکتے ہیں ... نہ ہی اسلام پسندوں کے ووٹوں میں ان کا شمار ہو سکتا ہے۔ نیپ ولی نے جو ووٹ مجموعی طور پر حاصل کئے ان کی کل تعداد۔ ۲ لاکھ ۷۹ ہزار ۴ سو ۹۸۔

پروگرام اور منشور کی یکسانیت کی بنا پر ان ووٹوں کو پیپلز پارٹی کے ووٹوں کے ساتھ تو شمار کر سکتے ہیں مگر سوشلزم کی داعی ہونے کی وجہ سے اس پارٹی کے ووٹوں کو اسلام پسندوں کے ساتھ شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مؤخر الذکر اعداد و شمار میں سے اسلام پسندوں کے حاصل کردہ صحیح ووٹ معلوم کرنے کے لئے ان میں سے عوامی لیگ۔ نیپ بھاشانی اور مسیحی لیگ کے ووٹوں کو بھی علیحدہ کرنا ضروری ہے اور جمعیت العلماء اسلام ہزاروی گروپ کے امیدواروں کے ووٹوں کو بھی اسلام پسندوں کے حاصل کردہ ووٹوں سے الگ کیا جانا ضروری ہے کیونکہ جمعیت العلماء اسلام اپنے پروگرام اور طریق کار میں اسلام پسندوں کی بجائے پیپلز پارٹی سے زیادہ قریب ہے۔ اسی وجہ سے اسلام پسندوں کے نزدیک قابل گردن زدنی جو اس جماعت کے قائدین کو سوشلسٹ علماء کے خطاب سے سرفراز کرتے رہتے۔

عوامی لیگ اور مسیحی لیگ کے حاصل کردہ مجموعی ووٹ .... ۳۰ ہزار ۳ سو ۸۸

نیپ بھاشانی نے جو ووٹ حاصل کئے ان کی مجموعی تعداد..... ۲۹ ہزار ۵ سو ۳۳

جمعیت العلماء اسلام ہزاروی گروپ کے حاصل کردہ کل ووٹوں کی تعداد ... ۹ لاکھ ۱۹ ہزار ۳ سو ۴

مندرجہ بالا تجزیہ کے بعد صورتِ حال اس طرح سے واضح ہوتی ہے

پیپلز پارٹی بشمول نیپ ولی بھاشانی مجموعی تعداد ..... ۶۳ لاکھ ۰۵ ہزار ۴ سو ۱۹

اسلام پسند (کونسل لیگ۔ قیوم لیگ۔ جماعت اسلامی، جمہوری پارٹی، کنونشن لیگ، مرکزی جمعیت العلماء پاکستان، مرکزی جمعیت العلماء اسلام (تھانوی گروپ) مرکزی اہل حدیث، سندھ مہاجر پنجابی پٹھان محاذ۔ بہاولپور متحدہ محاذ۔ بلوچستان متحدہ محاذ۔ خاکسار وغیرہم ووٹوں کی کل تعداد ... ۴۰ لاکھ ۴۰ ہزار ۶ سو ۴۳

اب مغربی پاکستان کے اس تجزیہ کے بعد صرف پنجاب کا تجزیہ کرتے ہیں۔ پنجاب کے لئے قومی اسمبلی میں کل بیاسی نشستیں مخصوص تھیں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ان میں سے باسٹھ حلقوں میں پیپلز پارٹی کے امیدوار کامیاب رہے اور دیگر تمام جماعتیں بہ شمول آزاد امیدوار صرف بیس نشستیں حاصل کر سکے۔ ان باسٹھ کامیاب امیدواروں میں سینتیس امیدوار ایسے ہیں۔ جو اسلام پسندوں اور دیگر تمام امیدواروں کے مقابلہ میں پچاس فی صد سے اسی فیصد تک ووٹ لے کر کامیاب ہوئے ہیں۔

جبکہ اٹھارہ امیدواروں کو، پچاس فیصد کم ووٹ ملے۔ لیکن ان کے ووٹوں کی مجموعی تعداد عام تمام آزاد یا اسلام پسند امیدواروں کے مجموعی ووٹوں سے زیادہ ہے

اس تمام تفصیلی خاکہ سے پتہ چلتا ہے کہ پیپلز پارٹی کے پچپن ۵۵ امیدواروں نے تمام اسلام پسندوں کے مجموعی ووٹوں سے زائد ووٹ حاصل کئے ہیں۔ اگر اسلام پسند مکمل اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے مندرجہ بالا نشستوں پر اپنا صرف ایک امیدوار بھی کھڑا کرتے تب بھی ان نشستوں پر شکست ان کا مقدر بن چکی تھی وہ باقی کی سات نشستوں پر کسی حد تک اثر انداز ضرور ہو سکتے تھے۔ لہٰذا نام نہاد پسندوں کا یہ پروپیگنڈا قطعاً بے بنیاد ہے کہ پیپلز پارٹی کی کامیابی ان کے ووٹ کئی جگہ تقسیم ہو جانے کی وجہ سے ہوئی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کی غالب اکثریت نے پیپلز پارٹی کے منشور کے حق میں یہ بانگ دہل اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے اور پسندوں کا جنازہ اس بری طرح سے نکالا ہے جسے تاریخ کے صفحات کبھی نہیں بھلا سکتے۔

اس کے مقابلے میں اسلام پسندوں کا جائزہ لیتے ہیں اور ایسے امیدوار تلاش کرتے ہیں جو پچاس فی صد سے زائد ووٹ لے کر کامیاب ہوئے تو ایسے امیدوار صرف پانچ ہیں جو پسندی کا لیبل رکھتے ہوئے پچاس فی صد سے زائد ووٹ لے کر قومی اسمبلی کے انتخابات میں کامیاب دیئے۔ جبکہ آزاد امیدواروں میں سے صرف ۲ امیدوار ایسے خوش نصیب تھے جو اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔

مودودیت کا اقدامِ خودکشی

شوکت صدیقی

عوام سے رابطہ پیدا کرنے کی مہم حصول اقتدار کی آخری کوشش



انتخابات میں ناکام ہونے کے بعد جماعت اسلامی کی حالت اس باؤلے کتے کی سی ہے جس کی دُم پر زہریلی مکھی بیٹھ جاتی ہے۔ مکھی کاٹتی ہے۔ کتا بلبلا کر دُم پر منہ مارتا ہے مگر دُم تک رسائی نہیں ہوتی۔ کتا غرّاتا ہے۔ دانت نکال کر چیختا ہے اور دُم پکڑنے کے لئے دائرے میں چکر لگاتا ہے۔ مکھی کاٹتی رہتی ہے۔ چکر تیز اور تیز ہوتے جاتے ہیں۔ کتا چیختا رہتا ہے ـــ آخر باؤلا ہو جاتا ہے۔

اپنی شکست پر پردہ ڈالنے کے لئے جماعت نت نئے بہانے تراش رہی ہے۔ نئے سے نئے عذر پیش کر رہی ہے۔ ۷ر دسمبر ۱۹۷۰ء کی شب ٹیلی ویژن پر قومی اسمبلی کے نتائج بتائے جا رہے تھے۔ جماعت کے مُہرے دھڑا دھڑ پٹ رہے تھے۔ کشتوں کے پشتے لگ رہے تھے۔ مودودیوں کے گھروں میں صفِ ماتم بچھی تھی۔ نتائج کا ٹپو اپنے عروج پر تھا۔ نصف شب کا عمل ہوگا کہ یکایک اناؤنسر نے ابوالاعلیٰ مودودی کا نام لیا۔ ذرا سا توقف کیا۔ ہم جیسے نصیبِ دشمناں مولانا داغِ مفارقت دے گئے، حرکتِ قلب جواب دے گئی۔ اتنا بڑا صدمہ برداشت کرنے کے لئے پتھر کا کلیجہ چاہیئے۔ مگر بات کچھ اور ہی نکلی۔ معلوم ہوا مودودی نے حکومت سے احتجاج کیا ہے کہ انتخابات میں زبردست دھاندلیاں ہوئی ہیں۔

سننے والے ششدر رہ گئے۔ حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے۔ بات ہی ایسی تھی۔ انتخابی دھاندلیوں کے خلاف کسی اور نے نہیں جماعت اسلامی نے احتجاج کیا تھا۔ چور کوتوال کو ڈانٹ رہا تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ انتخابی دھاندلیاں کس طرح ہوتی ہیں۔ چند ہی گھنٹے پہلے کا ذکر ہے۔ انتخابات کی گہما گہمی تھی۔ پولنگ اسٹیشنوں پر ووٹروں کی قطاریں لگی تھیں۔ جگہ جگہ فوجی تعینات تھے۔ پولیس والے گشت کر رہے تھے۔ حکم تھا کہ ووٹروں کو پولنگ اسٹیشن تک لانے اور لے جانے کے لئے امیدوار سواریوں کا بندوبست نہیں کریں گے۔ یہ فعل خلافِ قانون تھا۔

دوسرے امیدواروں کے ووٹر بسوں میں، تانگوں میں یا پیدل چل کر آتے مگر جماعت کے امیدواروں کی جانب سے بے میٹر کی ٹیکسیاں اور نئے نئے ماڈلوں کی کاریں اِدھر سے اُدھر دوڑتی پھرتی تھیں۔ ان کے ساتھ پی آئی اے، جامعہ کراچی اور کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن کی گاڑیاں بھی ووٹر ڈھونے میں مصروف تھیں کھلے بندوں حکم عدولی ہو رہی تھی۔

ایک ایک پولنگ اسٹیشن پر جماعت اسلامی کے کئی کئی کیمپ تھے۔ شامیانے تھے، قناتیں تھیں، ریشمی پرچم لہراتے، زرنگاری بینر جھلملاتے، زرق برق لباس میں صف بستہ رضاکار ایستادہ تھے۔ کیمپ کے اندر چمکتی ہوئی کرسیاں تھیں، صوفے تھے، میزیں تھیں۔ میزوں پر خاصدان تھے، آبدان تھے، قرابے تھے، گلاس تھے، چائے اور شربت کے دور چلتے تھے۔ پیالیاں بجتی تھیں۔ پلیٹیں کھڑکھڑاتی تھیں۔ بقول شخصے پیسہ پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ کیمپ کی سج دھج دیکھ کر دعوتِ ولیمہ کا گمان ہوتا تھا۔ جماعت کی گاڑیاں ووٹروں کو لے کر کیمپ پر آ کر ٹھہرتیں تو ایسا غلغلہ پڑتا جیسے بارات اتری ہو۔ گاڑیوں کے دروازے کھلتے۔ ووٹر خراماں خراماں برآمد ہوتے۔ پُر رُعب جسم، مکلّف لباس، مشیخت چہرے۔ آواز اس طرح نکالتے جیسے حلق میں مُرغ پھنس گیا ہو۔

جماعت کے ووٹروں کی عجب شان تھی۔ جدھر سے گزرتے خوشبو کی لپٹیں آتیں، دعائیں وردِ زباں ہوتیں۔ موقع و محل سے انہیں زیرِ لب پڑھتے۔ کیمپ پر پہنچنے کی دعا علیحدہ تھی، پولنگ اسٹیشن میں داخل ہونے کی کچھ اور۔ بیلٹ بکس میں پرچی ڈالتے وقت کچھ اس سے بھی مختلف۔ ان دعاؤں کو ازبر کرنا آسان نہ تھا۔ جماعت کے ایک بزرگ صورت ووٹر کو ہم نے دیکھا۔ بیلٹ بکس میں ووٹ ڈالتے تھے۔ بار بار دعا یاد کرتے تھے پر دعا یاد نہ آئی۔ انہوں نے ووٹ نہ ڈالا۔ پولنگ افسر سے معذرت چاہی۔ اس نے سبب

ٹرانسسٹر اور ریڈیو کے ڈیلر جماعتیے خود کو پروفیسر کہلواتے ہیں

پوچھا۔ انہوں نے حیلہ تراشا۔ عذر بے تکا تھا۔ ٹو پولنگ افسر نے زیادہ جرح نہ کی۔ وہ جامعہ کراچی کا کوئی استاد تھا۔ رشتے میں مودودیوں کا عم زاد تھا۔

جماعت کے یہ بزرگ ووٹر افتاں وخیزاں کیمپ واپس پہنچے۔ سراسیمگی کا عالم تھا۔ چہرے سے پریشانی ٹپکتی تھی۔ کسی رضا کار نے گھبراہٹ کا سبب معلوم کیا۔ فرمایا "دعا بھول گیا"۔ پوچھا گیا "کونسی دعا؟" زچ ہو کر بولے "اماں، وہی دعا، جسے ووٹ ڈالتے وقت امیر جماعت اسلامی نے پڑھنے کی ہدایت فرمائی تھی۔" سننا تھا کہ سارے کیمپ میں کھلبلی پڑ گئی۔ فوراً ان بزرگ کو دعا ازبر کرائی گئی۔ باقاعدہ ریہرسل ہوا۔ اور جب وہ ہر حربے سے مسلح ہو گئے تو انہیں از سرِ نو ووٹ ڈالنے کے لئے بھیجا گیا۔ اس آن بان سے جاتے تھے کہ رستم کا بدن زیرِ زمین کانپتا تھا۔

یہ سلسلہ تمام دن چلتا رہا۔ جماعت کی گاڑیاں ووٹر لاتی رہیں۔ لے جاتی رہیں۔ ووٹروں کی فہرست پر نشانات لگتے رہے۔ یہ فہرستیں مختلف نوعیت کی تھیں ان کی تیاری پر جماعت نے سال سوا سال پہلے ہی سے کام شروع کر دیا تھا۔ تکمیل ان کی کئی مرحلوں میں ہوئی پہلے الیکشن کمیشن کے دفتر سے فہرستیں حاصل کی گئیں۔ پھر جماعت کے تنخواہ دار کارندے ان کی نقلیں لے کر نکلے۔ دروازے دروازے جا کر دستک دی۔ خود کو الیکشن کمیشن کے عملے کا آدمی ظاہر کیا اور اپنی آمد کا مقصد ووٹروں کی جانچ پڑتال بتایا۔ یہ کارندے عام طور پر اس وقت پہنچتے، جب مرد کام کاج کے سبب باہر ہوتے۔ گھروں میں مستورات ہوتیں۔ ان سے آسانی کے ساتھ یہ سراغ مل جاتا کہ کتنے نام و پتے غلط ہیں۔ کتنے مندرجات درست نہیں ہیں۔ کتنے ووٹر نا بالغ ہیں۔ کتنے دوسری جگہ منتقل ہو چکے ہیں، شہر سے باہر ہیں یا بیرونی ممالک میں ہیں۔ ان اطلاعات کی روشنی میں فہرستوں پر مختلف نشانات لگائے جاتے۔

ایک مرحلہ اس طرح طے ہوا۔ دوسرے مرحلے پر نئے کارندے مقرر ہوئے۔ یہ گھر گھر جا کر ووٹروں سے ان کے سیاسی نظریات معلوم کرتے۔ مگر ان معلومات پر اکتفا نہ کیا گیا۔ مودودیئے چونکہ ہر کام فری میسن کی طرح صیغۂ راز میں کرتے ہیں لہٰذا آسانی سے کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔ چنانچہ تیسرے مرحلے پر مخبر چھوڑے گئے۔ ان میں بڑی تعداد عورتوں کی تھی۔ یہ گھروں میں جا کر اندر کا بھید معلوم کرتیں۔ کرید کرید کر اہلِ خانہ سے ان کے خیالات کی ٹوہ لیتیں۔ جب یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تو پوری چھان بین کے بعد الیکشن کمیشن سے جماعت کے خالص ووٹروں کے غلط مندرجات درست کرائے گئے۔ فہرستوں پر نظرِ ثانی کی گئی۔ انہیں از سرِ نو مرتب کیا گیا۔ ووٹروں کی علیحدہ علیحدہ درجہ بندی کی گئی۔ ان کے لئے مختلف رنگ تجویز کئے گئے۔ سرخ، گلابی، سبز، نیلا اور سیاہ۔ سرخ رنگ سوشلسٹوں کے لئے، گلابی ان کے ہمدردوں کے لئے، سبز مسلم لیگیوں کے لئے اور نیلا جماعتِ اسلامی کے لئے تھا۔ سیاہ رنگ کا عقدہ نہ کھلا جو آخر کار جماعت کا رنگ قرار پایا۔

جماعت کے خالص ووٹروں کے بارے میں بڑی دلچسپ حکایتیں مشہور ہیں۔ وہ نوجوان لڑکیاں جو سالہا سال سے ۱۳ سال سے ۱۴ کی نہ ہو سکی تھیں انتخابی فہرستوں میں راتوں رات نہ صرف بالغ ہو گئیں بلکہ ۱۸ سال کی سرحد بھی عبور کر گئیں۔ یہ کاروبار تو خالص ووٹروں کی تعداد میں ہوا۔ اب آگے کا حال سنیئے۔ ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ جن ووٹروں کی تفصیلات میں غلطیاں پائی گئیں۔ انہوں نے دو سال قید بامشقت اور ہزار روپے جرمانے کے خوف سے اپنے ووٹ نہ ڈالے۔ یہ ووٹ جماعت نے بھگتائے۔ جو پولنگ اسٹیشن نہ جا سکے ان کے بھی اور جو اس روز شہر میں موجود نہ تھے ان کے بھی۔ جو مر چکے تھے ان کے بھی اور جو بیمار تھے ان کے بھی۔ مودودیوں نے ووٹ بھگتانے کا کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ انمٹ روشنائی مٹانے کا سراغ انہوں نے پا لیا تھا۔ اور اپنے اخبارات کے ذریعے حفظ ماتقدم میں پہلے ہی یہ ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا کہ روشنائی مٹ سکتی ہے۔ اور انہوں نے اسے مٹا کر دکھا بھی دیا۔

> ریاضی کا ہر قاعدہ، کلیہ آزماتے ہیں کہ یہ ثابت کیا جائے کہ جماعت کی شکست میں قسمت کو دخل تھا ورنہ ووٹ اس نے زیادہ حاصل کئے

چنانچہ ابوالاعلیٰ مودودی نے جب انتخابات میں دھاندلی کی دہائی دی تو بات کسی کے دل کو نہ لگی نہ بیگانوں کو نہ اپنوں کو۔ سنا ہے یہ نکتہ نوابزادہ شیر علی خاں نے سمجھایا تھا۔ جب شیر علی کا پٹرا ہوا تو مودودیوں نے اس سے سبق حاصل کیا۔ انتخابی دھاندلیوں کے شور سے باز آگئے۔ خوف دامنگیر ہوا کہ مبادا معاملہ آگے نہ بڑھ جائے اور تحقیقات کی نوبت آجائے۔ سارا پول کھل جاتا۔ جان و مال دونوں کا زیاں ہوتا۔ ہاتھ کچھ نہ آتا۔

جب یہ تیر خالی گیا اور حربہ ناکام ہوا تو مودودیئے چھلنی لے کر بیٹھے۔ اب وہ اعداد و شمار چھانتے ہیں۔ ووٹروں کا میزان نکالتے ہیں۔ جمع تفریق کرتے ہیں۔ ان کو ضرب دیتے ہیں۔ حاصل ضرب کو تقسیم کرتے ہیں۔ کبھی اکائی کا فارمولا لگاتے ہیں، کبھی دہائی کا۔ ریاضی کا ہر قاعدہ، ہر کلیہ آزماتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کیا جائے کہ جماعت کی شکست میں قسمت کو دخل تھا ورنہ ووٹ اس نے زیادہ حاصل کئے۔

قسمت کی اس ہار جیت پر ہمیں کانپور کے پہلوان شوبھا سنگھ یاد آئے۔ جو ہر دنگل ہارتے تھے اور شرط بدھ کر ہارتے تھے اور جب اکھاڑے سے باہر آتے تو یہ شیخی بگھارتے "اجی کیا پوچھتے ہو بڑے زوروں کی کشتی ہوئی۔ میں نے ہاتھ ملاتے ہی تھپکی دے کر چیر اس ماری۔"

مودودی جماعت سیاسی اعتبار سے قرونِ وسطیٰ کی یادگار ہے

وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ لنگی دے کر میں نے دھوبی پاٹ لگایا۔ کمر پر لاد کر اوپر اٹھایا کہ دھوبوں سے دے مارون ظالم نے زمین دبا لی۔ بڑا چور جسم تھا۔ نکل گیا ہاتھ سے۔ پھر سامنے آیا۔ جھکائی دے کر میں نے زمین پر دو ہتڑ مارا اور سونت لئے دونوں پٹے۔ دھڑام سے منہ کے بل گرا۔" لوگ پوچھتے "پھر کیا ہوا؟" کڑک کر کہتے "یارو پہلے یہ تو سن لو کہ داؤں میں نے کیسے کیسے نکالے اور کتنے نکالے۔" سننے والے بے چین ہو کر کہتے "مگر ہوا کیا؟" جواب ملتا "ہونا کیا تھا۔ داؤں پیچ تو میں نے ہی زیادہ لگائے مگر کشتی وہی مار لے گیا۔ یہ سب قسمت کے کھیل ہیں بھائی۔"

جب اعداد و شمار سے بھی شکست کی پردہ پوشی نہ ہو سکی تو ابوالاعلیٰ نے مودودی نے یہ تازہ ترین دعوے کیا کہ "انتخابات سے یہ ثابت ہوا کہ تعلیم یافتہ لوگوں نے جماعت کو ووٹ دیئے اور اب جماعت عوام پر پوری توجہ صرف کرے گی۔" جماعت کے حامی یہ تعلیم یافتہ لوگ کون ہیں؟ پروفیسر غفور احمد! وہی جو ٹرانسسٹر اور ریڈیو کے ڈیلر ہیں اور صدر میں دکان کرتے ہیں۔ پروفیسر اس لئے کہلواتے ہیں کہ اردو کالج میں چند ماہ عوضی پر جونیئر لیکچرار رہ چکے ہیں۔ اور اب اس پروفیسری کو وہ "نشاطِ روح" کی طرح دبائے پھرتے ہیں۔

جماعت کے ایک اور تعلیم یافتہ ہیں، ڈاکٹر اظہر قریشی عرف اطہر قریشی۔ انتخابات سے پہلے یہ اظہر قریشی تھے انتخابات کے دوران اطہر قریشی ہو گئے۔ ایک روایت یہ بھی سننے میں آئی ہے کہ اظہر قریشی ان کے مرحوم بڑے بھائی تھے۔ کچھ جائیداد کا چکر ہے اور جائیداد کے ہیر پھیر میں ناموں کا بھی ہیر پھیر ہو گیا، غرضیکہ یہ بھید آج تک نہ کھل سکا کہ اصلی اظہر قریشی ہیں یا اطہر قریشی۔ اور یہ بھید بھی نہ کھل سکا کہ یہ ڈاکٹر ہیں تو کس طرف سے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی وہ نہیں۔ ایم بی بی ایس بھی نہیں۔ سلوتری یعنی مویشیوں کے ڈاکٹر بھی نہیں۔ لے دے کے ایک ہی ڈاکٹری رہ جاتی ہے اور وہ ہے ہومیوپیتھی۔ اس میں سند کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ ڈاکٹری گھر بیٹھے مل جاتی ہے۔ ویسے اب جرّاح اور کمپونڈر بھی ڈاکٹر کہلاتے ہیں۔

معلوم نہیں اس طرح ڈاکٹر کہلانے پر کوئی تعزیر ہے یا نہیں۔ یہ حقیقت پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن بہتر طور پر جانتی ہو گی کہ اس کا تعلق اس کے ارکان کے حقوق سے ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ امیرِ جماعت کی مراد ایسے ہی تعلیم یافتہ لوگوں سے ہے جو اپنے احساسِ کمتری پر پردہ ڈالنے کے لئے خواہ مخواہ کے دُم چھلّے لگائے پھرتے ہیں اور ان پڑھ مودودیوں پر رعب

اگر جماعتِ اسلامی کے

ہم خیال تعلیم یافتہ

کہلانے لگے تو "تعلیم

یافتہ" کہلانا لوگوں

کی چڑ بن

جائے گی

گانٹھتے ہیں۔ ورنہ سیدھی بات یہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہونا اور جماعتِ اسلامی کا حامی ہونا دو متضاد باتیں ہیں۔ جماعتِ اسلامی سیاسی اعتبار سے قرونِ وسطیٰ کی باقیات ہے۔ تاریخ کے ہر عہد میں ایسی تنظیمیں معاشرتی ارتقا کے عمل میں سب سے بڑی رکاوٹ رہی ہیں۔ عظمتِ رفتہ ان کا ذہنی اثاثہ اور "ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم" ان کا سہارا ہے۔ یہ معاشرے کا سب سے زیادہ رجعت پسند طبقہ ہے۔ اس کا خمیر قدامت پسندی سے اٹھا ہے۔ ۱۹۷۱ء کا ذہن سب کچھ ہو سکتا ہے مگر جماعتِ اسلامی کا ہم خیال نہیں ہو سکتا اور اگر جماعتِ اسلامی کا ہم خیال ہو سکتا ہے تو تعلیم یافتہ نہیں کہلا سکتا۔ بلیک مارکیٹیے، اسمگلر، منافع خور، رشوت خور اور نا اہل اگر آسودہ ہو جائیں اور سفید پوش بن جائیں تو یہ نو دولتیے، احساسِ کمتری کے مریض تعلیم یافتہ نہیں کہلا سکتے۔ یہ علم و آگہی پر بہتان ہے۔

اگر جماعتِ اسلامی کے حق میں ووٹ دینے والے اسی طرح تعلیم یافتہ کہلانے لگے تو وہ دن دور نہیں جب "تعلیم یافتہ" کہلانا لوگوں کی چڑ بن جائے گی۔ اسی طرح جیسے ایوب خاں نے لفظ "دانشور" کو بدنام کر دیا اور اب یہ حال ہے کہ کسی اہلِ علم کو دانشور کہا جائے تو اس کی تیوری پر بل پڑ جاتا ہے۔

البتہ جماعت نے یہ اچھا فیصلہ کیا کہ اب وہ عوام کے اندر جا کر کام کرے گی۔ کم از کم اسے یہ علم تو ہو جائے گا کہ عوام کبھی غلط فیصلہ نہیں کرتے۔ آخری تجزیہ میں ان کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے اور تاریخ کے ارتقائی عمل کے عین مطابق ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اس پر یہ بھی منکشف ہو جائے گا کہ ابوالاعلیٰ مودودی جس انداز سے اب تک سوچتے رہے ہیں وہ فکری بنیاد ہی سرے سے ٹیڑھی ہے۔ ساتھ ہی ان پر یہ بھی آشکار ہو جائے گا کہ یہ عوام ہی ہیں جو پیداواری قوتوں کو تبدیل کرتے ہیں۔ پیداواری رشتوں کو تبدیل کرتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں معاشرتی تبدیلیاں لاتی ہیں اور معاشرہ تبدیل ہوتا ہے تو آگے بڑھتا ہے پیچھے نہیں پلٹتا۔ معاشرے کے اس ارتقائی عمل سے نئے خیالات اور نئے تصورات جنم لیتے ہیں، نئی معیشت، نئی سیاست اور نئی ثقافت جنم لیتی ہے۔ علم ہمیں یہی سکھاتا ہے۔ اور جسے اس علم کا عرفان ہے اور وہی پڑھا لکھا کہلاتا ہے، جماعتِ اسلامی کو ووٹ دینے والا نہیں۔ اس کی بالائی منزل پر تو "کرایہ کے لیے خالی ہے" کا بورڈ آویزاں ہوتا ہے۔

بہرحال ابوالاعلیٰ مودودی جو زندگی بھر عوام کو جاہل اور نکمّا سمجھتے رہے، انہیں گمراہ اور عقل سے عاری بتاتے رہے انتخابات کے بعد اس نتیجے پر تو پہنچے کہ قوت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں لیکن عوام کی قربت حاصل کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ یہ سودا جماعتِ اسلامی ایسی رجعت پسند تنظیم کو بہت مہنگا پڑے گا۔ یہ اس کے لئے عزم خودکشی ہو گا ☆

بھرم کھل جائے گا ظالم تری قامت درازی کا۔

پروفارغ بخاری

غزل

وہ شعلہ آہِ شرر بار میں بھی آئے گا
شگاف آہنی دیوار میں بھی آئے گا

فقیہہ وقت کی مسند بہت بلند سہی
غریب شہر کے کردار میں بھی آئے گا

جو حادثہ ادب و فن پہ آج گزرا ہے
کبھی تو معرضِ اظہار میں بھی آئے گا

جو آج گونج رہا ہے فضائے گلشن میں
وہ انقلاب گل و خار میں بھی آئے گا

نہ کوئی جبر کی طاقت بچا سکے گی جسے
وہ حوصلہ کبھی فنکار میں بھی آئے گا

وہ اپنے وقت کا یوسف سہی مگر فارغ
کبھی تو مصر کے بازار میں بھی آئے گا

سنٹرل جیل پشاور
۲۷ ستمبر ۷۰ء



حسن ناصر

جوھر میر

مرثیہ

بچھڑ گیا ہے جو تو موجۂ ہوا کی طرح
پلٹ کے آئے تو مانوں مری صدا کی طرح

کہاں ہے تو جو سنیں تیری داستاں تجھ سے
زمانہ چپ ہے ترے بعد نقشِ پا کی طرح

گِلہ نہ کر کہ مسلسل ہے زندگی کا عمل
ترے وجود میں مضمر تھی ارتقاء کی طرح

ہر ایک آنکھ سے ٹپکا ہے تو لہو بن کر
کہ تو دلوں میں ہے اک نالۂ رسا کی طرح

ترے نصیب، ترے درد کی دوا ہی نہ تھی
ترے نصیب، تری یاد ہے دوا کی طرح

ترے خلوص کی قیمت نہ مل سکی تجھ کو
زمانہ تیرے لئے بن گیا خدا کی طرح

تو مر گیا ہے تو کیا بے صلہ وفا تیری
جبینِ وقت سے پھوٹے گی اک ضیا کی طرح

بھلا سکے گا نہ کوئی تجھے حسن ناصر
لبوں پہ نام ترا آئے گا دعا کی طرح

عوامی انقلاب کا وقت آگیا ہے

انتخابات کے فوری بعد ہر شئے کیجی مہنگی ہوگئی ہے۔ عوام دوست طاقتوں کا بنیادی فرض ہے کہ وہ اس سازش پر سے پردہ اٹھائیں، ایک ایک آدمی کو ایک ایک گلی کوچے اور دیہات میں ان چیزوں کو بے نقاب کریں تاکہ مزدور کسان اور ان کے دوست دشمنوں کو ذرا اور قریب سے پہچان لیں اور گلے سڑے نظام کے محافظوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے صف آرا ہو جائیں۔

لندن سے محترم ایم کے جنجوعہ (سابق ایئر کموڈر) نے ذیل میں ان دشمنوں کی نشاندھی کی ہے۔ ان مکروہ ذہنوں کی ناپاک سازش کو عوام تک پہنچانا قارئین الفتح کا کام ہے۔ ان عوام تک جو بلند شعور کے مالک ہیں لیکن لکھنے پڑھنے کی صلاحیتوں سے محروم ہیں —————— (ادارہ)

ایم۔ کے جنجوعہ

یہ ایک عام فہم حقیقت ہے کہ جب پاکستان کے عوام نے استحصالی طبقات یعنی سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوکر شاہی کو رد کر دیا ہے تو وہ طبقے حتی الوسع انتقامی کارروائی کے لئے منصوبے بنائیں گے۔

جس نوعیت کا نظام ان پر سینکڑوں صدیوں سے مسلط رکھا گیا ہے۔ عوام نے اس سے پیدا شدہ مسائل، مصائب و مظالم سے ان گنت تجربات حاصل کئے ہیں۔ اب انہیں یہ سمجھنے میں دقت نہیں ہو گی کہ مفاد پرستوں نے محض اپنے مفاد کی خاطر اور نہایت مکاری و عیاری سے کام لے کر نوع انسان کو گروہوں میں تقسیم کیا تاکہ وہ اپنے اپنے گروہوں کے محنت کشوں کو استحصال کا شکار بنائیں اور پھر سامراج کی شکل اختیار کر کے اپنی حدود سے باہر جا کر دوسرے گروہوں کو گرفت میں لیں۔ اس ظالمانہ، فاسد اور فاسق نظام نے حرص و ہوس کو عام کیا۔ لاتعداد جرائم کو جنم دیا۔ انسان کو انسان کا دشمن بنایا۔ بھائی کو بھائی کا قاتل بنایا۔ کوئی ایسا نفسیاتی مرض نہیں جو اس نظام کی پیداوار نہ ہو۔ کوئی ایسا جرم نہیں کہ جس کی تہہ میں ذاتی مفاد پوشیدہ نہ ہو۔ افراد، خاندانوں، قبیلوں اور قوموں کے درمیان عداوت و انتقام کا سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ پاکستان کا کسان جانتا ہے کہ یہاں ایک جھاڑی کی ملکیت کے تنازعہ پر انسان کا خون بہایا جاتا رہا ہے۔ بلکہ پشت با پشت قتل کا سلسلہ جاری رہ چکا ہے۔ ایسے المناک واقعات کی ذمہ داری ان پر ہے جو لوٹ کھسوٹ کے نظام کے بانی تھے۔ اور فی زمانہ یہ ذمہ داری ان طبقات پر عائد ہوتی ہے، جو اس نظام کو جاری رکھنے پر مُصر ہیں۔

سینکڑوں صدیوں کے ناگفتہ بہ مظالم اور تلخ تجربات نے آخر کار محنت کش عوام کو اپنی آنکھوں پر سے پردہ ہٹانے پر مجبور کیا۔ ان کا شعور بیدار ہونے لگا۔ ان کے قدم روشنی کی جانب بڑھنے لگے۔ اور انہوں نے اپنے اصلی دشمنوں کو پہچاننا شروع کیا۔ جب صحیح دشمنوں کی شناخت ہو گئی تو انہوں نے اپنے اصلی دوستوں کو پہچان لیا۔ ان کے دشمن بلا شک و شبہ وہ طبقات تھے اور ہیں جنہوں نے محنت کش عوام کو تقسیم در تقسیم کر کے ان کا استحصال کیا اور جو اب اسے جاری رکھنے پر اصرار کر رہے ہیں لیکن مزدور کا دوست کسان اور کسان کے دوست مزدور اور نادار عوام۔ ان سب کے دوست و معاون باشعور طلبہ اور دانشور اور چھوٹے کاروباری اور ادنیٰ ملازم اور باشعور سامراج دشمن افراد، یہ تمام دوست متحد ہونا شروع ہوئے۔ انہوں نے باہمی تعاون پیدا کیا۔ اتحاد و اتفاق نے انہیں اپنی بے پناہ قوت کا احساس دلایا۔ خود اعتمادی بڑھی۔ تنظیم مضبوط سے مضبوط تر ہوئی۔ اور دنیا کے وسیع رقبوں میں عملی جدوجہد کے ذریعے انہوں نے بظاہر خونخوار مگر حقیقت میں حقیر دشمن کا قلع قمع کیا۔ کیونکہ منظم عوامی طاقت کے آگے تمام قوتیں خس و خاشاک کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اب پاکستان کے عوام نے ابتدائی مراحل طے کر لئے ہیں۔ بنیادی، اصولی اور ذہنی طور پر انہوں نے اپنے طبقاتی دشمنوں کو ٹھکرا دیا ہے۔ اب ان عوام دشمن طبقات کا ردِ عمل سامنے آ رہا ہے۔ اور آتا رہے گا۔ وہ اپنی اپنی بھیانک، مکروہ اور عیارانہ شکل میں عوام کے سامنے آتے رہیں گے۔ اور عوام کو کسی سطح پر ان طبقات کی عوام دشمنی کی بابت اگر کوئی شبہ رہ گیا ہو تو وہ ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گا۔ جب تک ان کا وجود باقی ہے تب تک یہ شکست خوردہ اور خوفزدہ طبقات اپنی بقاء کے لئے ہاتھ پاؤں ماریں گے۔ وہ عوام کو فریب دینے اور مرعوب و مجبور کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کریں گے۔ مجموعی طور پر استحصالی طبقات کچھ عرصہ اپنے زخموں کو چاٹیں گے۔ عوام دشمن منصوبے بنائیں گے۔ اور عیاری کی مشق کریں گے۔ کیونکہ فی الحال ان کے لئے کوئی اور قدم اٹھانا آسان نہیں۔ لیکن اجارہ دار سرمایہ دار نے بوکھلاہٹ میں فوری قدم اٹھا لیا ہے۔ یہ تاریخی عمل کے عین مطابق ہے۔ یہ نہ تو تعجب کی بات ہے اور نہ ہی یہ غیر ضروری پریشانی کا موجب ہونی چاہیئے۔ یہ طبقے اپنی موت کو مدت سے دعوت دے چکے ہیں۔ اب ایسے اقدام سے وہ اسے قریب تر لا رہے ہیں۔ ان اجارہ داروں کے تیئس برس کے اقدامات نے عوام کو ان سے متنفر کیا ہے تو ان کے موجودہ شدید ردِ عمل اور شدید ترین عوام دشمن حرکات، عوام کے دلوں میں جو نفرت ہے اسے محبت میں تبدیل نہیں کر سکتی اور نہ ہی عوام اب بہ آسانی مرعوب ہو سکتے ہیں بلکہ نفرت اور بڑھے گی حتیٰ کہ وہ ناقابلِ برداشت ہو جائیں گے۔

یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جس پر انہیں کوئی اختیار نہیں۔ ان کے عوام دشمن ردِ عمل کا شدید ہوتے رہنا اور عوام کا ان سے مزید متنفر ہونا ہی وہ حالات پیدا کرتا ہے جو آخر کار طبقاتی

ملک اور قوم سے غداری ہمیشہ اونچے طبقوں کے افراد کرتے ہیں

تصادم کا موجب بنتا ہے۔ ایسے حالات ہی عوامی تنظیم کی بنیاد کا باعث بنتے ہیں اور اسے وسیع اور مضبوط تر بنانے میں ممد ہوتے ہیں۔

تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ محنت کش عوام پر ان طبقات کی دشمنی مزید واضح کی جائے کیونکہ اب وہ اپنے اصلی روپ میں سامنے آنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور انہیں شناخت کرنے اور ان کی نشاندہی کرنے میں نسبتاً زیادہ آسانی ہوگی۔ نیز ایک اور اہم حقیقت جو عوام پر واضح کی جانی چاہیئے وہ یہ ہے کہ اس نوعیت کے ظالمانہ اقدامات صرف سرمایہ دارانہ نظام میں ممکن ہوتے ہیں۔ جو نظام دولت کے ارتکاز کی اجازت دیتا ہو، وہی نظام اس جمع کی ہوئی دولت کے تحفظ کا ذمہ دار ہوتا ہے اور دولت چند افراد تک محدود ہو کر ملک کے عوام سے چھن جاتی ہے اس لئے جو سرمایہ داروں کے محافظ ہوتے ہیں وہ عوام کے مخالف ہوتے ہیں۔

دولت کو چند ہاتھوں میں اکٹھا ہونے دینا عوام سے دشمنی اور ملک سے غداری کے بند کھولنے کے مترادف ہے چند افراد جب مٹھی بھینچ لیں تو قوم کی دولت عوام تک پہنچنے سے رک جاتی ہے۔ یہ ایک خطرناک حقیقت ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ خطرناک امر یہ ہے کہ چند افراد ملک کی اسی فیصد دولت اپنی جیبوں میں ڈال کر ملک کے باہر لے جا سکتے ہیں بلکہ وہ اپنی کرسی سے اٹھنے کی زحمت کئے بغیر بھی قوم کی دولت کو باہر بھیج کر ملک کی معاشی زندگی کو تباہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا قوموں سے غداری ہمیشہ نام نہاد اونچے طبقات اور افراد ہی کرتے ہیں۔ خواہ وہ سرمایہ دار یا جاگیردار (جو کسان کی محنت سے سرمایہ اکٹھا کرتے ہیں) ہوں خواہ دفتر شاہی ہوں، وزیر ہوں یا ملک کے سربراہ۔ کروڑوں کسان اپنے اپنے کھیت اٹھا کر دوسرے ممالک میں منتقل نہیں کرتے۔ نہ ہی کروڑوں مزدور اپنے اوزار یا اپنی محنت و ہنر ملک کے باہر لے جاتے ہیں لہٰذا محنت کش عوام ہی صحیح معنوں میں محبِ وطن ہوتے ہیں۔ وہی قوم اور ملک کا اصلی سرمایہ ہیں۔

ان دنوں سرمایہ داروں نے معاشی ابتری پیدا کرنے کی جو سازش کر رکھی ہے اور پوری قوم کو یرغمال کی حیثیت دے دی ہے۔ یہ ایک ایسا جرم ہے جسے کسی طرح بھی معاف نہیں کیا جا سکتا اور جلد یا بدیر اس کے مرتکب افراد مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے کئے جائیں گے اور انہیں کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے گا۔ چند حقیر انسانوں کا کروڑوں عوام کو عذاب میں مبتلا رکھنا۔ قوم کو معاشی تباہی سے دوچار کر دینا صرف مفاد پرست یعنی سرمایہ دارانہ نظام میں ہی ممکن ہو سکتا ہے یہ چند گھرانے دانستہ اور دیدہ دلیری سے ملک کی تباہی کا اعلان کر رہے ہیں۔ انہوں نے پوری قوم کو چیلنج کیا ہے لیکن نظام حکومت کی کوئی مشینری حرکت میں نہیں آتی۔ وہ مشینری جو مہلک ہتھیاروں سے لیس انہی افراد کے تحفظ کی خاطر ہر لمحہ تیار رہتی ہے۔ وہ انتظامیہ ملک کے تمام باشندوں کے خلاف کی ہوئی ایسی مجرمانہ حرکت قطعی خاموش ہے۔ عوام کو اب یہ سمجھنے میں بالکل دشواری نہیں ہونی چاہیئے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں چند گھرانوں کے "حقوق [illegible]" ہوتے ہیں اور کروڑوں انسانوں کے حقوق پر [illegible] دی جاتی ہے۔

چند ہاتھوں میں دولت کا ارتکاز عوام دشمنی اور ملک سے غداری کے بند کھولنے کے مترادف ہے

ان سرمایہ داروں کی سازش کے خلاف کارروائی کون کرے گا؟ کیا کارروائی دفتر شاہی کرے گی جو بنیادی طور پر ملک کے نظم و نسق کے ذمہ دار ہیں؟ منتخب سیاسی جماعتیں برسرِ اقتدار ہوں یا فوجی حکومت ہو یہی نظام کو چلاتے ہیں اور اسے قائم رکھنے کے دعویدار ہیں۔ وہ ذخیرہ اندوزی کو کیسے روکیں گے؟ خوراک اور دیگر روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کی قلت اور ان کی قیمتوں میں روز افزوں گرانی کا سدِ باب کیسے کریں گے؟ صنعتی اور کاروباری اداروں میں سرمایہ کاری کیسے جاری رکھیں گے؟ اداروں کے حصص کی قیمت گرنے سے کیونکر روکیں گے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اغلباً نوکر شاہی یہ کہہ کر اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے گی کہ ملک کے نظم و نسق کی ذمہ داری مارشل لاء حکام پر ہے حالانکہ وہ اتنا کہہ کر بری نہیں ہو سکتی۔ تاہم ایک حد تک وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہے کیونکہ مارشل لاء نافذ کر کے فوجی حکام نے آخری فیصلہ یعنی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے اس لئے اب ان پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ قوم کو معاشی ابتری و بدحالی سے بچانے کی تدبیر کریں۔ یا نوکر شاہی سے کروائیں۔ ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ عام انتخابات کروا کر اور عوامی نمائندوں کو اقتدار منتقل کرنے کی راہ ہموار کر کے مارشل لاء کے سربراہ اور صدرِ مملکت نے قابلِ صد ستائش کارنامہ انجام دیا ہے لیکن تاوقتیکہ عوامی نمائندے اقتدار کی کرسی سنبھالیں وہی ملک کے ناظم علی ہیں۔ مجرم جرائم کے مرتکب آج ہو رہے ہیں۔ وہ چند ماہ میں قوم کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ عوام منتخب سیاسی رہنماؤں کے برسرِ اقتدار آنے پر ان کا محاسبہ کریں گے۔ لیکن اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ اس وقت تک عوام کے سامنے کوئی جواب دہ نہیں اور اگر ان کے کربناک مسائل اور قوم کے معاشی مسائل کو التوا میں رکھا جاتا ہے۔ ایسا نظریہ رکھنے کے یہ معنی ہوں گے کہ چند افراد کو اپنی دولت ملک کے مفاد کے خلاف استعمال کرنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی ہے۔

آخر میں ایک بار پھر یہ کہنا ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ہی عوام دشمن اور ملک کے مفاد کے منافی سازشیں ممکن ہوتی ہیں۔ اقتدار خواہ سیاسی رہنماؤں کے پاس ہو یا باگ ڈور فوجی حکام کے ہاتھ میں ہو، سرمایہ دار مہلک معاشی ابتری اور بدحالی پیدا کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس نظام میں تمام مشینری ذاتی سرمائے کے تحفظ کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ جب تک عوامی جمہوری نظام

باقی صفحہ ۲۶ پر

ترکی به ترکی

دلآزار کتاب کے خلاف احتجاجی مظاہروں کو دبانے کے لئے پیاسی نے بھی ہڑتال کر دی

شاہ احمد نورانی، تعویذ والوں، میلاد والوں کی پریشانی

:- درویش :-

میلاد پڑھاتے اور حلوہ کھاتے کھاتے کچھ لوگ اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔ کیونکہ انہوں نے عورتوں کو یقین دلایا تھا کہ ان کی گودیں ہماری دعاؤں سے بھر سکتی ہیں۔ اپنی گود بھرنے کے لئے ان بے چاری عورتوں نے بیلٹ بکس بھرے۔ چابی کو جنت اور اولاد کی چابی جانا۔ ان چابی والوں نے اپنے جھنڈوں پر روضۂ رسولؐ بنایا، کلمہ لکھا۔ عمر بھر تعویذوں کی اور دعاؤں کی ہول سیل تجارت کرنے والے اب علمی اور سیاسی مسائل پر بولتے ہی نہیں، اخباری بیان بھی دینے لگے ہیں —— اللہ کرے زور بیاں اور بھی زیادہ ——

زنانہ ووٹوں سے کامیاب ہونے والے ان مردوں نے کہا ہے "پی پی ایل کا ہنگامہ رسول اکرمؐ کی شان میں گستاخی کرنے والی کتاب کے خلاف احتجاج کو دبانے کے لئے کھڑا کیا گیا ہے اور یہ سرخوں کی سازش ہے۔"

یہ واقعی زیادتی کی بات ہے کہ جماعت اسلامی اور اس کی ذیلی تنظیمیں تو رسول اکرمؐ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کرنے والی کتاب کے خلاف احتجاجی مظاہرے کر رہی تھیں۔ یہ الگ بات، کہ اس میں گرفتار ہونے والے طلبہ جہانگیر بدر اور اعجاز سیفی وغیرہ جماعت اسلامی کے مخالف ہیں۔ وہ ناموسِ رسولؐ سے عشق میں جماعت سے آگے نکل گئے، اور جماعت والے شراب خانے لوٹتے رہ گئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ سارے ملک میں ہونے والے مظاہرے صرف پی پی ایل کے ہنگامے سے دب گئے۔ سرخوں کے پر بہت نکل آئے ہیں۔ دعویٰ تو مولانا کو علم غیب کا تھا۔ لیکن سرخوں کے پاس روحانی قوت زیادہ نکلی۔ ان کو ان مظاہروں سے ہفتوں پہلے علم ہو گیا تھا کہ یہ ہونے والا ہے۔ انہوں نے پی پی ایل کی انتظامیہ سے کہا کہ وہ ۳۰ اکارکنوں کو برطرف کر دے۔ پھر ان کی برطرفی کے بعد انہوں نے صدر یحییٰ، مجیب اور بھٹو کو خطوط لکھے۔ بھوک ہڑتال کا اعلان کیا، اور پھر دلآزار کتاب کے خلاف ہونے والے مظاہروں سے صرف ایک روز پہلے بھوک ہڑتال بھی شروع کر دی۔ کتاب کے خلاف مظاہرے تو بے ساختہ تھے اور کوئی پروگرام نہ تھا۔ جبکہ بھوک ہڑتال کرنے والوں نے بہت پہلے سے مکمل پروگرام بنایا تھا کہ کون کس روز بھوک ہڑتال کرے گا۔ کتاب کے خلاف ہنگامے ملک بھر میں شروع ہو گئے۔ بھوک ہڑتال کا دائرہ صرف پی پی ایل کے دفتر کے سامنے تک محدود تھا۔ کتاب پر پابندی لگ گئی تو بڑے شہروں میں ہنگامے ختم ہو گئے۔ سرخوں کی اس سازش میں پولیس اور انتظامیہ بھی مل گئی کہ پی پی ایل جیسے چھوٹے سے مسئلے پر انہوں نے آنسو گیس چھوڑ کر، لاٹھیاں برسا کر اور فوج کو بلا کر اسے بہت بڑا ہنگامہ بنا دیا۔ اور پھر اخبارات بھی اس میں شریک ہو گئے کہ جنگ جیسے اخبار نے اس ہنگامے کو شہ سرخی بنا دیا۔ نہ جانے جماعت کے خاص آدمی محمود احمد مدنی اور مولانا شاہ احمد نورانی کے بیچے جمورے ظہور الحسن بھوپالی کیا کر رہے تھے کہ جنگ اخبار میں پی پی ایل کے ہنگامے کو شہ سرخی بنا دیا گیا۔ ان ساری کوششوں سے جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے پاکستان کا مشترکہ ہنگامہ دب گیا۔ یہ بڑے افسوس کی بات تھی۔ اس کے بعد لائل پور، سکھر اور نواب شاہ وغیرہ میں کتاب کی اشاعت کے خلاف ہنگامے شروع ہوئے۔ امید تھی کہ یہ دینی مسئلہ پھر اہمیت اختیار کر جائے گا۔ اور پی پی ایل جیسے ہنگامے پیچھے رہ جائیں گے۔ لیکن اب پیاسی والوں نے گڑبڑ کر دی۔ پی آئی اے کی ہڑتال بھی دلآزار کتاب کی اشاعت کے خلاف احتجاج کو دبانے کے لئے کی گئی۔ اور یہ ایسی سازش تھی کہ اس میں مولانا شاہ احمد نورانی کو بھی پھنسا لیا گیا، کہ وہ ہڑتال میں مصالحتی کمیٹی کے قائدین کر گئے۔ ان کے جانے سے مصالحت کے بجائے ہنگامہ ہو گیا۔ مولانا شاہ احمد نورانی کو دلی صدمہ ہوا ہے کہ وہ ایک ایسے ہنگامہ کا خود حصہ بن گئے جن سے کتاب کی اشاعت کے خلاف احتجاج دب گیا۔ اس کفارہ کے لئے وہ اب سوچ رہے ہیں کہ کیا کیا جائے۔ پروگرام یہ ہے کہ وہ ۱۰۱ تعویذ مفت تقسیم کریں گے، ان کا کوئی معاوضہ نہ لیں گے اور انہوں نے یہ ارادہ بھی کیا ہے کہ آئندہ وہ اس قسم کے لایعنی اور غیر روحانی ہنگاموں کے سلسلے میں نہ تو بیان دیں اور نہ ہی حصہ لیں۔ پی آئی اے کی ہڑتال سے بھلا ان کا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ انہیں خواہ مخواہ اس میں پھنسا دیا گیا۔ یہ ساری ظہور الحسن بھوپالی کی سازش ہے، انہوں نے انتخابات میں کامیاب ہونے کے لئے تو چابی کا ٹکٹ لے لیا تھا مگر ہیں تو آزاد ہیں نل کر بک جانے والے آدمی۔ انہوں نے ہمارے تعویذ والے مولانا کو اس "بھیڑے" میں پھنسا دیا۔

ادھر مولانا کے کچھ ساتھی پنجاب میں جیلوں میں چلے گئے۔ ان کا جیلوں سے بھلا کیا تعلق۔ آج تک اس چکر میں نہ پڑے تھے۔ حلوے کی بجائے اب جیلوں کی دال روٹی کھانی پڑے گی۔ تھانوی صاحب کی جمعیت تو جماعت کا "ششو لوانے" بننے سے انکار کر کے جلدی جان چھڑا گئی تھی۔ اب جمعیت علمائے پاکستان کو یہ بیگار کرنی پڑ رہی ہے —— اللہ تعالیٰ جمعیت علمائے پاکستان پر رحم کرے۔

چترال کی حسین وادی میں انسانوں کا شکار کھیلا جاتا ہے



چترال پر نوابوں کی حکمرانی کی تاریخ پانچ سو سال پرانی ہے اور چترال کے باشندوں پر ظلم و تشدد اور قتل و غارت گری کو بھی اتنے ہی سال بیت چکے ہیں اس سرزمین پر ظالم کو نواب نہیں مہتر کہا جاتا تھا۔ چترال والے کہتے ہیں کہ مہتروں کے مظالم کے بارے میں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے ان جیسا ظالم نہ آج تک کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ آئندہ کوئی ان کے ریکارڈ توڑ سکے گا

مہتر اپنی رعایا کی زمینوں، مویشیوں اور جائداد پر قبضہ کرنا، جبری مشقت لینا اور بے قصور شہریوں کو کالی کوٹھریوں یا برف کے سرد کمروں میں قید کرنے کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ رابیت، بول دوبور، میراخور اور میرشکار جبری بے گار کی وہ قسمیں تھیں جن کے تحت مہتروں کے لئے ایندھن، کاشتکاری، گھوڑوں کی دیکھ بھال، شکاری جانور پالنے اور سڑک صاف کرنے اور برف کے تودے صاف کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔ ان کاموں پر مامور رعایا ایک دو دن یا ایک دو مہینے یا سال بھر اپنے فرائض انجام نہیں دیتی تھی بلکہ بیگار تمام عمر کے لئے مقدر بن جاتی تھی اور اس کا معاوضہ تک نہیں ملتا تھا۔

اس کے علاوہ تنگی، آشی مت، اُصیل، ساوریگ اور عشیر کا اطلاق ہوتا تھا۔ ان کے تحت ہر گھر سے سال میں ایک من سے دس من غلہ لیا جاتا تھا۔ فی گھر ۱۲ مویشی ہر سال جبری طور پر دینے پڑتے تھے۔ ہر سال ہر گھر کو چار پانچ مرتبہ دس سیر گھی شہزادوں کی سلامی کے طور پر چار پانچ گائے بیل اور مویشی دینے پڑتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ مرغی، انڈے اور دودھ بھی رعایا سے وصول کیا جاتا تھا۔ یہ تمام اشیاء مہتروں اور شہزادوں کے قلعوں میں جمع ہوتی تھیں اور مہتر دربار کر کے غریبوں چھینا ہوا مال اپنے دوستوں، رشتے داروں اور عزیزوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔

چترال کی تاریخ میں سب سے سیاہ دور شجاع الملک کا تھا۔ اس جیسا عوام دشمن مہتر کوئی نہیں گزرا اور اس کے دور کے مظالم کی مثال بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اس کے دور میں عوامی رہنماؤں کو چترال بدر کر دیا گیا۔ جائدادیں زبردستی چھین لی گئیں اور متعدد رہنماؤں کو کال کوٹھریوں اور برف کے سرد کمروں میں بند کر دیا گیا۔ اسی کے راج میں عوامی رہنما پیر عبدالجبار خان کی جائداد پر زبردستی قبضہ کیا گیا اور انہیں مجبوراً افغانستان میں سکونت اختیار کرنا پڑی۔ ان کی جائداد کا وارث مہتر کا لڑکا متاع الملک بنا اور اسی طرح جناب بلبل شاہ کو چترال سے نکال کر ان کی جائداد مہتر نے اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دی۔

شجاع الملک نے رعایا پر ظلم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے لاتعداد شادیاں کر کے ۱۶ بیٹے پیدا کئے ان کو مختلف علاقوں کا گورنر مقرر کیا اور ان کے لئے عوام سے زمین چھین کر قلعے تعمیر کروائے۔ قلعوں کی تعمیر کے دوران کام کرنے والوں کو بھی کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے برعکس تعمیراتی ساز و سامان تک مزدوروں کو فراہم کرنا پڑا۔ جو قلعے تعمیر کئے گئے ان میں قلعۂ چترال، قلعۂ دوروش، قلعۂ مستوج، قلعۂ لنکوہ، قلعۂ شوغور، قلعۂ دونوموس، قلعۂ دارسن، قلعۂ درکوپ اور قلعۂ شاہ گرام بھی شامل ہیں۔

گورنروں نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ظلم و تشدد روا رکھا۔ اور اذیت پہنچانے کے لئے ایسے طریقے ایجاد کئے کہ انہیں قلمبند کیا جائے تو انسانیت سرنگوں ہو جائے۔ ظالم گورنروں نے شاوار کے نام سے ایسے افراد کو ملازمت پر مامور کیا جو انہیں ہر گاؤں

الفتح



نمائندہ الفتح

"میں تم لوگوں سے افضل ہوں" خدا نے اسی لئے مجھے تم پر حکومت کرنے کے لئے بھیجا ہے"۔ پھر اس نے حکم دیا "میرے پاؤں کو بوسہ دو۔"

کے حالات مہیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ چار بوبھے جو عوام کی مشکلات کا تذکرہ کرنے والوں کی فہرست تیار کرتے اور گورنروں تک پہنچاتے تھے۔

متاع الملک حد درجے کا عیاش تھا۔ رقص و سرود کی محفلوں میں نہ صرف دلچسپی لیتا تھا بلکہ خود بھی ناچنے میں مہارت رکھتا تھا۔ شراب کے نشے میں ہر وقت دھت رہتا۔ ایک اسی عالم میں ایک گاؤں پہنچا۔ لوگ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان سے مخاطب ہو کر بولا "تم نہیں جانتے میں کون ہوں؟ میں اعلیٰ حضرت اور سُرخ ہوں۔ تم لوگوں سے افضل ہوں۔ خدا نے اسی لئے مجھے تم پر حکومت کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ پھر ایک شخص سماگل کو حکم دیا "تم میرے پاؤں کو بوسہ دو" اس ظالم نے سیبواحت، بھوڑ، ہارون، سوئم مشہد اور تلونج کی زمینوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ آدیریت، کیرٹیخ کمار گوچ، کاوج گورغ، اشتر شیری، دو مارغ اور جانہ الیو بلاخ کی چراگاہوں پر قابض تھا۔ ان پر بکری چرانے والوں سے ٹیکس وصول کرتا تھا۔

پاکستان بانو چترال کے عوام نے سوچا کہ ان کے دن پھریں گے۔ انہیں بھی بنیادی حقوق ملیں گے۔ لیکن پاکستان کے بعد بھی تین افراد پر مشتمل مشاورتی بورڈ قائم کر دیا گیا۔ اس کے تینوں ارکان میں شہزادے، اتالیق اور جاگیر دار تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے ہاتھوں عوام پس رہے تھے۔ اور حکومتِ پاکستان نے بھی عوام کی باگ ڈور ان کے سپرد کر دی۔ ان سے انصاف کی توقع رکھنا عبث تھا۔ انہوں نے جو سیاہ کارنامے انجام دیئے ان میں سر فہرست کہنہ قانون ہے۔

کہنہ قانون کے تحت کوئی شہری شہزادوں، جاگیرداروں اور اس قبیل کے دوسرے لیٹروں سے اپنی زمینیں واپس طلب نہیں کر سکتا۔ اس کے خلاف احتجاج اور مظاہرے ہوئے تو لاٹھی گولی کی سرکار حرکت میں آگئی۔ فائرنگ کی گھن گرج سے عوام کو خاموش کر دیا گیا۔ مصیبت تو یہ ہے کہ حکومتِ پاکستان نے چترال میں نظم و نسق اور انتظامی امور کی نگرانی کے لئے جن افسروں کو مامور کیا وہ شہزادوں کے دوست بن جاتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ہمیشہ عوامی مفاد کے خلاف فیصلے کئے اور چترال سے دولت سمیٹ کر رفو چکر ہو گئے۔

افسروں نے شہزادوں کو خوش رکھنے کے لئے جوڈیشل کونسل اور میزانِ شرعی قائم کئے اور ان دونوں اداروں کے ارکان شہزادوں کے دوست اور رشتے دار مقرر کئے جاتے تھے۔ نام نہاد کونسل کے ارکان نے شہزادوں سے گٹھ جوڑ کر کے ادجور، آرکاری، دوردش، بازدرم، شیشی، ملکوہ اور گریمبرٹ کے عوام کو ان کی زمینوں سے بیدخل کیا۔ اس کی زد میں آنے والوں میں آرکاری کے شاہنوار خان، نادر خاں سوم، بڑاسلان سوئم، پردم آرثاران و بج، شاہین، لوڈیگرام اور خوش لال کار بھی شامل ہیں۔ شہزادوں کے ظلم و ستم کے پیشِ نظر لوگوں نے چترال خالی کر دیا اور وہ مغربی پاکستان کے مختلف حصوں میں ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض تو شہزادوں کے زخموں کی تاب نہ لا کر جامِ شہادت نوش کر لیا ہے مثلاً ادجور کے بابا خاں، اور خوش حال خاں۔ اسی طرح مشہور رہنما سید حاجی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے۔

ان حالات میں جب صدرِ پاکستان نے ۱۹۶۹ء میں چترال کو پاکستان میں ضم کرنے کا تاریخی اعلان کیا تو چترال کے شہزادوں نے اس کی زبردست مخالفت کی جن عوام نے اس پر خوشی کا اظہار کیا انہیں جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ بعد میں کمشنر مالاکنڈ کے حکم پر قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ عوام نے سیاسی شعور کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہاں پیپلز پارٹی کا تنظیمی کام شروع کیا تو شہزادوں نے اسے بھی سبوتاژ کرنا چاہا۔ انہوں نے کرائے کے غنڈوں کے ذریعے پیپلز پارٹی کے رہنما جناب سید حسن پر قاتلانہ حملہ کرایا۔ سید حسن شدید زخمی ہوتے اور تقریباً دو ماہ تک زیرِ علاج

باقی صفحہ ۴۲ پر

رُباعیات

منور فیضی

آہوں کی یہ بارات گزر جائے گی
اشکوں کی یہ برسات گزر جائے گی
ہم دن کے اُجالے پہ یقیں رکھتے ہیں
جتنی ہو سیہ رات گزر جائے گی

بے کیف یہ نغمے، یہ ترانے کب تک
یعنی گل و بُلبل کے فسانے کب تک
شاعر ہو تو کچھ وقت کی تمیز کرو
دھوکے میں رہو گے یوں نہ جانے کب تک

دیوار کو نفرت کے گراتا ہوں میں
ہر دل سے کدورت کو مٹاتا ہوں میں
اس طرح سے دیتا ہوں ثبوتِ "اخلاص"
دشمن کو بھی سینے سے لگاتا ہوں میں

آلام و مصائب سے نکل سکتا ہوں
میں ٹھوکریں کھا کر بھی سنبھل سکتا ہوں
کہتے ہیں لوگ مجھے نقیبِ فطرت
شاعر ہوں میں ماحول بدل سکتا ہوں



ناصر زیدی

غزل

وہی چمن ہے وہی جورِ باغباں ہے ابھی
فضائے صحنِ گلستاں دھواں دھواں ہے ابھی

چلے چلو کہ سفر ہے ابھی طویل بہت
نشانِ منزلِ مقصود بے نشاں ہے ابھی

کہاں کے بندِ سلاسل، کہاں کے سنگِ گراں
کہ میرا عزمِ جواں میرِ کارواں ہے ابھی

اسی لئے تو چمکتی ہے برق رہ رہ کر
چمن کے گوشے میں اِک میرا آشیاں ہے ابھی

تم اپنے عہدِ وفا پر نہ رہ سکے قائم
مری وفا کا سفینہ رواں دواں ہے ابھی

نہ مطمئن ہو کہ آنکھوں سے بہہ رہا ہے لہو
مرے ندیم! یہ آغازِ داستاں ہے ابھی

متاعِ جنسِ وفا کی نہ بات کر ناصرؔ!
یہ چیز وہ ہے جو بازار میں گراں ہے ابھی

صحافیوں کے حقوق اور صحافتی اقدار کے لیے جد وجہد کرتے ہوئے بے روزگار ہونا برنا صاحب کا معمول بن گیا ہے۔ پاکستان ٹائمز سے برطرف ہونے کے بعد انہیں حال ہی میں روزنامہ "سن" میں ملازمت ملی تھی لیکن یہاں ان کی مدتِ ملازمت دو ماہ سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔ یہ ان کی تازہ بے روزگاری کی داستان ہے۔ (ادارہ)

منہاج برنا سازش کا شکار ہو گئے

وہ صحافی کونسے ہیں جنہوں نے پوری برادری کی گردنیں شرم سے جھکا دی ہیں

وہاب صدیقی

"آپ گھاس کھودتے ہیں۔ خاموش رہو۔ تم نہیں جانتے تم کس سے بات کر رہے ہو۔"
یہ کہہ کر اس نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ یہ جملے یہ اندازِ گفتگو کسی سی ایس پی افسر کا نہیں بلکہ روزنامہ "سن" کے سینیر اسسٹنٹ ایڈیٹر مسٹر احمد حسن کا ہے۔ مسٹر احمد حسن کے مخاطب کہنہ مشق صحافی اور پنڈی میں "سن" کے خصوصی نامہ نگار مسٹر منہاج برنا تھے۔ وہی منہاج برنا جو پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے جنرل سیکرٹری ہیں اور "برنا بھائی" کے نام سے صحافی برادری میں مشہور ہیں۔ برنا صاحب کا اگر کوئی قصور تھا تو صرف یہ کہ انہوں نے مسٹر احمد حسن سے کہا تھا کہ وہ کراچی میں بیٹھ کر پنڈی یا اسلام آباد کی ڈیٹ لائن سے خبریں نہ گھڑیں کیونکہ یہ انتہائی درجے کی صحافتی بددیانتی کے ساتھ ساتھ انتہائی خطرناک بات ہے۔ اس طریقۂ کار کی وجہ سے نامہ نگاروں کو اپنے فرائض انجام دینے میں مشکلات پیش آتی ہیں اور ایسی خبریں ان کے نام منسوب ہو جاتی ہیں جو انہوں نے نہ بھیجی ہوں۔ مسٹر برنا نے احمد حسن سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر پنڈی اور اسلام آباد کی خبریں کراچی میں گھڑنا اتنا ہی ضروری ہو تو پھر کراچی کی ڈیٹ لائن سے بنائی جائیں۔ مسٹر احمد حسن اپنی غلطی تسلیم کرنے اور اظہارِ ندامت کرنے کی بجائے برنا صاحب پر برس پڑے اور ایسے جملے اور اندازِ بیان اختیار کیا جو صحافت کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

مسٹر منہاج برنا نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو روزنامہ "سن" کے مدیر مسٹر شمیم احمد کو ایک تار بھیجا جس میں کہا تھا کہ وہ مسٹر احمد حسن کو پنڈی اور اسلام آباد کی خبریں کراچی میں نہ گھڑنے کی ہدایت کریں۔ اس درخواست پر شمیم احمد چراغ پا ہو گئے اور نہایت ڈھٹائی اور جانبداری سے کام لیتے ہوئے برنا صاحب کے بیان کو "بے بنیاد الزام" قرار دیا اور بذریعہ تار معافی مانگنے کا مطالبہ کیا۔

مسٹر برنا نے جواب دیا کہ ان کا بیان حقیقت پر مبنی ہے اور معافی کا مطالبہ مسٹر احمد حسن سے کیا جائے جو کراچی میں بیٹھ کر پنڈی اور اسلام آباد کی خبریں بناتے ہیں نہ کہ مجھ سے جس نے اس کی نشاندہی کی ہے۔ مسٹر برنا نے اپنے بیان کے ثبوت میں دو خبروں کی مثال پیش کی۔ ایک خبر ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو روزنامہ "سن" میں اسلام آباد کی ڈیٹ لائن اور "سن رپورٹ" کے حوالے سے شائع ہوئی تھی۔ یہ دفترِ خارجہ کے ترجمان کا بیان تھا جو اس نے روزنامہ "سن" کے رپورٹر داؤد سبحانی کی ایک خبر پر کیا تھا جو انہوں نے اردن سے بھیجی تھی۔ دفترِ خارجہ کے بیان کو خبر رساں ایجنسی اے۔ پی۔ پی نے کریڈ کیا لیکن اگلے دن ایجنسی کے حوالے کی بجائے اسے "سن رپورٹ" کے حوالے سے شائع کیا گیا حالانکہ مسٹر منہاج برنا نے یہ خبر نہیں بھیجی تھی۔ اسی دن اخبار کے آخری صفحہ پر "ٹی۔ وی انٹرویو آف لیڈرز" کی سرخی کے ساتھ اسلام آباد کی ڈیٹ لائن سے ایک "سن رپورٹ" شائع کی گئی۔ یہ خبر نہ تو برنا صاحب نے بھیجی تھی اور نہ ان کے ساتھی مسٹر لیلین نے۔

لیکن مسٹر شمیم احمد اپنی بات پر اڑے رہے اور معافی مانگنے کے لئے اصرار کرتے رہے حالانکہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ احمد حسن پنڈی میں روزنامہ "سن" کے نامہ نگار خصوصی بننا چاہتے ہیں اور اس لئے وہ اپنی نیوز انچارج ہونے کی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر اسلام آباد اور راولپنڈی کی خبریں کراچی میں بنا رہے ہیں۔ تاکہ غیر مصدقہ خبریں شائع کر کے منہاج برنا کے کام میں مشکلات پیدا کی جائیں اور انہیں غیر ذمہ دار صحافی ظاہر کیا جائے۔ خود مسٹر شمیم نے "سن" کے ناشر پرویز لاری اور ان کے دوست چوہدری محمد یوسف کی موجودگی میں تسلیم کیا تھا کہ برنا صاحب کا بیان سو فیصد درست ہے اور وہ خبریں مسٹر احمد حسن نے کراچی میں گھڑی تھیں۔ سنا جاتا ہے کہ مسٹر شمیم نے ایک بار اپنے حلقۂ احباب میں کہا تھا کہ "مسٹر برنا کی شکایت تو ٹھیک ہے لیکن انہوں نے یہ شکایت خفیہ خط کے ذریعے کی ہوتی تو مناسب ہوتا۔ ایسی شکایات بذریعہ تار دینے سے ہمارا اخبار بدنام ہو جائے گا۔" بہر حال مسٹر شمیم نے بحیثیت مدیر اپنی یا مسٹر احمد حسن کی غلطی تسلیم نہیں کی بلکہ الٹا مسٹر برنا کو ۹ نومبر ۱۹۷۰ء کو بغیر کسی نوٹس یا اظہارِ وجوہ کا موقعہ دیئے ملازمت سے برطرف کر دیا۔

جناب منہاج برنا کو ایک منظم سازش کے تحت الگ کیا گیا ہے تاکہ آزادیٔ صحافت کو پروان چڑھنے کا موقع نہ ملے۔ انہیں طرح طرح سے تنگ کیا گیا۔ متعدد یاددہانیوں کے باوجود انہیں ٹیلیگرافک اتھارٹی نہیں دی گئی — ایکریڈیٹیشن کے جو فارم انہوں نے ایڈیٹر کے دستخط کے لئے بھیجے تھے وہ دبا لئے گئے۔

روزنامہ "سن" کے مالک حسنین لاری، سردار

"برنا صاحب نے خفیہ خط کے ذریعے شکایت کی ہوتی تو مناسب ہوتا"

بہادر خاں، سابق ایئر مارشل نور خاں اور سابق آئی۔سی ایس افسر ظفر احمد بتائے جاتے ہیں۔ انڈس کیمیکل میں مزدوروں کا استحصال کرنے اور اپنی تجوریوں کو بھرنے کے بعد بھی ان کا پیٹ نہ بھرا تو انہیں ملکی اقتدار کی سوجھی رجعت پسند اور سامراج نواز حیاتوں نے مقبوضہ اخبارات ہی کو اپنی کامیابی کا واحد راستہ سمجھا تھا۔ کونسل مسلم لیگ کو اپنے پروپیگنڈا کے لئے ایک اخبار کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ۲۰ اگست ۱۹۷۰ء کو روزنامہ "سن" کا اجراء کیا گیا۔ اگرچہ یہ آزاد اور غیر جانبدارانہ صحافت کا دعویدار تھا لیکن اس نے ابتداء ہی سے عوامی دشمنی اور سامراج نوازی کا ثبوت دیا۔ عوامی جمہوریہ چین اور سوویت یونین کے خلاف مسلسل مضامین شائع کئے۔ اس کے بعد روس کے ہفت روزہ "نیو ٹائم" کا ایک مضمون شائع کیا جو ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جس مضمون کو روزنامہ "سن" نے اپنے ادارتی صفحہ پر نمایاں طور پر شائع کیا تھا۔ اس کے لکھنے والے کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کس پارٹی کے چیئرمین ہیں۔ اس نے مسٹر بھٹو کو نیشنل عوامی پارٹی کا صدر بتایا تھا۔ پاکستان کی صحافتی تاریخ میں روزنامہ "سن" ہی ایسا اخبار ہے جس نے تائیوان سے تجارت کی افادیت پر تین خطوط شائع کئے اور اس طرح سے اس نے فارموسا کی پٹھو حکومت کو تسلیم کرنے پر زور دیا۔

روزنامہ "سن" کی انتظامیہ کی اسی مزدور دشمنی اور سامراج نوازی اور ایڈیٹر کے ناروا سلوک کی وجہ سے انجمن صحافیاں کراچی کے سابق نائب صدر اور کہنہ مشق صحافی مسٹر زوار حسن احتجاجاً استعفا دے چکے ہیں۔

روزنامہ "سن" کے اجراء کو ابھی صرف پانچ ماہ ہوئے ہیں لیکن اس نے صحافیوں کی برطرفی، مزدور دشمنی اور سامراج نوازی کی جو مثال پیش کی ہے اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب تک نشر و اشاعت کے ذرائع سرمایہ داروں کے پاس رہیں گے۔ آزادیٔ صحافت اور عوامی طاقتوں سے دوستی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکیگا۔

صحافت کی آزادی ہمارا مسلک ہے اور ٹریڈ یونین پر یقین رکھتے ہوئے کارکن صحافیوں کے حقوق کے لئے جدوجہد پر ہمارا ایمان ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اخباری وڈیروں کی بدعنوانیوں اور استحصالی سرگرمیوں کو طشت از بام کرنے کے ساتھ ایسے صحافیوں کا کچا چٹھا بیان کرنا بھی ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں جو صحافت کو صرف اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنائے رکھنے پر مصر ہیں۔ ایسے ہی کارکن صحافیوں کی وجہ سے پوری صحافتی برادری کو ایک بدنام زمانہ اخبار کے مالک قاضی اکبر کے یہ ریمارک سن کر اپنا سر جھکانا پڑا تھا کہ "ہم ان کے کیڈر کی کس طرح تخصیص کریں جبکہ یہ ایک طرف تو سیاسی رہنماؤں سے ملتے اور دوسری طرف طوائفوں سے بھی ان کے رابطے

پنڈی کا

نمائندہ بننے کی خواہش

نے "سن" کے

اسسٹنٹ

ایڈیٹر کو

سازشی بنا دیا

ہے

ہیں اور صحافیوں کا یہ واحد طبقہ ہے جس کا ہم معاشرے میں کوئی مقام متعین نہیں کر سکتے۔"

"سن" میں برنا صاحب کی علیحدگی کو دو کارکن صحافیوں کے درمیان تنازعہ قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ ایک ایسے صحافی کارکن کے خلاف اخبار کے مالک اور صحافیوں کی برادری میں اس کے مفادات کا تحفظ کرنے والے عناصر کی سازش ہے جس کی پوری زندگی اصولوں کی خاطر جدوجہد سے عبارت ہے۔

عوامی انقلاب کا وقت آگیا ہے

: صفحہ ۲۰ سے آگے :

رائج نہیں ہوتا تب تک عوامی یعنی قومی مسائل حل نہیں ہو سکتے اور عوامی جمہوریت لانے کے لئے عوامی تنظیم لازمی ہے جو مسلسل جدوجہد کرے۔ حتیٰ کہ وہ تمام استحصالی طبقات پر غالب آکر ان کا قلع قمع کرے۔ جدوجہد کی کامیابی کا انحصار کسان مزدور اتحاد اور ان کے دیگر تمام دوستوں کے تعاون پر ہے۔ جب یہ اتحاد و تعاون مکمل ہو جائے گا تو عوامی طاقتوں کو نیچا کوئی نہیں دکھا سکے گا۔ سرمایہ داروں کی سازشیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

انتخابات میں پاکستان کے عوام نے اتحاد و تعاون کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے تمام استحصالی طبقات کو واضح پیغام دے دیا ہے کہ وہ ان سے متنفر ہیں۔ سرمایہ داروں نے عوام دشمنی کا مزید ثبوت مہیا کیا ہے۔ ان کے معاون طبقات نے بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کی حرکات کی تائید کر کے عوام دشمنی میں حصہ لیا ہے۔ اب انتخابات کے اصولی اتحاد و تعاون کو پاکستان کے عوام نے عملی جدوجہد میں تبدیل کرنا ہے تاکہ وہ سرمایہ داروں کی سازش کا گلا گھونٹ دیں۔ اور اس نظام سے ہمیشہ کے لئے نجات پائیں۔ عوام کے حوصلے بلند ہیں، ان کے عزائم راسخ ہیں البتہ ان کی تنظیم تا حال مکمل نہیں جس کی وجہ سے دشمن وار کر رہا ہے۔ اب وقت ہے کہ عوام اپنی صفوں کو منظم کر کے عوامی انقلاب لانے کے لئے تیاری کریں"۔

اُردو کسی خاص علاقے کے افراد کا وِرثہ نہیں ہے

ــــ: شمشاد علی وارثی :ــــ

سندھ میں اب رجعت پسندوں نے سیاسی ناکامیوں کے بعد اپنے بچے کھچے سیاسی مہروں کو ملا کر اپنی سیاسی زندگی کے لئے اردو کو ایک بار پھر ہتھیار بنایا ہے۔ ان لوگوں کے گمراہ کن رویئے نے اردو کے ان تمام شیدائیوں کو جن میں ہر علاقے سے تعلق رکھنے والے موجود ہیں بعض کو شدید غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں، کہ اردو کسی خاص گروہ یا کسی خاص علاقے کے افراد کا ورثہ نہیں ہے کیسی خاص علاقے کے افراد ہی صرف اردو کی محافظت کے دعویدار بھی نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ اسے پروان چڑھانے میں تقریباً ہر علاقے کے افراد کا حصہ رہا ہے۔ اس اعتبار سے اردو پر سندھی، پنجابی، پٹھان، بلوچی اور مہاجر سب کا برابر کا حق ہے.

لیکن اردو کو جس طرح رجعت پسندوں نے مختلف علاقوں میں اپنے ذاتی سیاسی اغراض کی خاطر استعمال کیا ہے وہ بھی ایک پوری تاریخ بن گئی ہے۔ اور اب جبکہ پھر وہ اسی پرانے حربے کو آزما کر سندھ کی پوری فضا کو گندا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو سندھ کے نئے اور پرانے سندھیوں کو باہم مل کر سنجیدگی سے یہ سوچنا چاہیئے کہ یہ کھیل کون لوگ رچا رہے ہیں اور اس کھیل کو رچا کر وہ کون سے مفادات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

۱۹۶۹ء میں بھی مشرقی پاکستان میں اردو کے چند نادان دوستوں نے اپنی قیادت کا سکہ جمانے کی خاطر اردو کے نام کو استعمال کیا تھا۔ حالانکہ اردو پہلے سے مشرقی پاکستان میں موجود تھی۔ اس نام نہاد تحریک کا جو نتیجہ نکلا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ غریبوں کو نقصانات ہوئے اور منافرت کی خلیج اس حد تک وسیع ہو گئی کہ مشرقی پاکستان میں آج آنکھیں ترستی ہیں کہ کہیں اردو کا ایک بورڈ نظر آ جائے۔ اس منافرت کو پیدا کرنے کے ذمہ دار یہی اردو کے نادان دوست تھے۔

پچھلے اڑھائی سال سے اندرون سندھ مختلف قسم کی ایسی تحریکیں چند افراد نے شروع کیں جس سے اس علاقہ کا امن تباہ ہوا۔ اور نئے اور پرانے سندھی کے درمیان منافرت کی خلیج وسیع ہوئی۔ اس کام میں دونوں ہی طرف سے گنتی کے چند افراد اور رجائی پہچانی شکلیں نظر آئی تھیں۔ ایک طرف سندھ متحدہ محاذ جسے سندھ محاذ اور دوسری طرف ایک اَن ہونا محاذ مہاجر پنجابی پٹھان محاذ پیش پیش رہے۔ جس کے بانی اور کنوینر نواب مظفر حسین خاں ہیں۔ سندھ میں ون یونٹ توڑنے کی تحریک زوروں پر تھی اور عوام پوری قوت کے ساتھ ون یونٹ توڑنے کی جدوجہد میں مصروف تھے تو دوسری طرف یہ محاذ مہاجر پنجابی پٹھان کے تحفظ کا نام لے کر اس کوشش میں مبتلا تھا کہ کسی طرح ون یونٹ قائم رکھا جائے۔ اور ان کا یہ فعل دونوں طبقوں میں منافرت پھیلا رہا تھا۔ دوسری طرف انتہا پسندوں کا دوسرا گروہ اس محاذ کے جواب میں مقامی بھائیوں کو ابھار رہا تھا۔ اگر اگست ۱۹۶۹ء میں حیدر آباد کے اندر اتحاد کانفرنس نہ ہوتی تو حالات انتہائی سنگین صورت اختیار کر چکے تھے۔

۲۶ جنوری ۱۹۶۹ء کو حیدر آباد کا وہ افسوس ناک واقعہ رونما ہوا جو سندھ کی تاریخ میں حیدر آباد کے شہریوں کے لئے چاہے وہ نئے سندھی ہوں یا پرانے ہمیشہ باعث شرم رہے گا۔ اور وہ لوگ جو اس واقعہ کے ذمہ دار ہیں محب وطن نہیں۔ جنوری ۱۹۷۰ء میں ملک میں سیاسی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو اس محاذ نے دوسرا رخ اختیار کیا۔ اور آبادی کے لحاظ سے علیحدہ نمائندگی کا مطالبہ کیا۔ ایک طرف سندھ میں سندھ پیپلز پارٹی نے جس نے شروع دن سے دونوں محاذوں کی شدید مخالفت کی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے ایک محاذ یعنی سندھ متحدہ محاذ کا مکمل طور پر صفایا کر دیا۔ اور اس محاذ کے تمام قائدین کو اس حد تک پہنچا دیا کہ وہ سیاست سے ریٹائر ہو کر بقیہ زندگی گمنامی میں گزاریں۔

دوسرے محاذ نے قیوم گروپ سے معاہدہ کیا اور پھر اس کو توڑا۔ حالانکہ اس تنظیم کے تمام افراد علیحدہ ہو چکے تھے۔ مگر اس محاذ کے کنوینر نے واحد قائد کی حیثیت سے اپنی جماعت کا انتخابی نشان الاٹ کرایا اور سندھ میں قومی و صوبائی اسمبلی کے بائیس امیدوار کھڑے کئے جن میں سے چند الیکشن سے پہلے ہی دستبردار ہو گئے ان میں کنوینر مہاجر، پٹھان، پنجابی کو چھوڑ کر باقی سب کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ اور کنوینر صاحب کی کامیابی کا سہرا بھی اصولی طور پر جمیعت العلمائے پاکستان اور حیدر آباد کے امیر جماعت اسلامی مولانا شوکت کے سر ہے۔ اگر اس حلقہ سے جماعت اسلامی کے نمائندہ مولانا شوکت دستبردار نہ ہوتے اور جمیعت العلمائے پاکستان پاکستان مسلم لیگ قیوم گروپ کی حمایت سے دستبردار ہو کر مہاجر پنجابی پٹھان محاذ کے کنوینر کی حمایت نہ کرتی تو اس محاذ کے کنوینر کی کامیابی ناممکن تھی۔ اس کامیابی کے بعد آجکل اس محاذ نے اردو کے سرپرست کا لبادہ اوڑھ لیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ وہ اردو کا تحفظ کریں گے۔

سوال یہ ہے کہ سندھ میں اردو کو کیا خطرہ ہے کونسی انتظامیہ نے یا سندھ کے کس قائد نے یہ کہا ہے

رجعت پسندوں کے پڑھے ہوئے مہرے تعصّب کی آگ بھڑکا رہے ہیں

کہ اردو ختم کر دی جائے۔ اس محاذ کے کنوینر کا بار بار یہ کہنا ہے کہ ان کا محاذ سندھی زبان کی ترقی کا مخالف نہیں بلکہ اس کا مقصد اردو کو انگریزی کی جگہ دلانا ہے۔ حالانکہ یہ بات صاف ہے کہ جب ہمارے ملک سے انگریزی ختم ہوگی تو اس کی جگہ ملک کی دو قومی زبانیں اردو اور بنگلہ لیں گی اور کوئی علاقائی زبان قومی زبان کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔ قاعدہ تو یہ تھا کہ اردو کے نادان دوستوں کو قومی زبان سے ہمدردی تھی تو یہ سندھی کا نام لئے بغیر یہ کہتے کہ انگریزی کو ختم کیا جائے تو یہ بات کہی جا سکتی تھی۔ کہ سندھ کا ہر فرد چاہے وہ پرانا سندھی ہو یا نیا سندھی اس مطالبہ میں شریک ہوتا۔ لیکن جس انداز میں اس محاذ نے اردو زبان سے ہمدردی ظاہر کر کے تحریک کا آغاز کیا ہے وہ قومی زبان سے دوستی نہیں بلکہ دشمنی ہے اور یہ وہی نادان دوست ہیں جو قومی زبان اردو کو مشرقی پاکستان میں ملے تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ اپنے اس عمل سے کوئی خدمت کر رہے ہیں۔

پچھلے سال جنوری میں حیدر آباد میں طلبہ کو جو نقصان پہونچا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ بے شمار طالب علم ایسے موجود ہیں جو امتحانات دینے سے رہ گئے۔ اور ان کی زندگی کا قیمتی سال ضائع ہوا۔

زمیندار اور ہاری کے مسئلہ کو جو ایک دیرینہ طبقاتی مسئلہ ہے۔ نئے اور پرانے سندھی کا قضیہ بنانا تعلیمی میدان میں طالب علموں کے اندر نئے اور پرانے سندھی کا سوال پیدا کر کے منافرت پیدا کرنا کوئی قومی خدمت نہیں کہا جا سکتا۔ مثال کے طور پر حیدر آباد کے سنجیدہ طبقہ، اس وفد کے ارکان پر جو آٹھ جنوری کو گورنر سندھ سے کراچی میں ملا۔ جس میں جناب مولانا محمد علی الوری۔ ایم این اے۔ محمد منیر آرائیں الوری ایم پی اے۔ جن دونوں صاحبان کا تعلق ریاست الور سے ہے، اور وہاں کی سرکاری زبان ہندی تھی۔ تیسرے ممبر جناب محمد عثمان کنیڈی اجمیری جنہوں نے اپنی زندگی کی آنکھ اسی حیدر آباد میں کھولی ہے۔ اور ان کے آبائی وطن اجمیر کی سرکاری زبان ہندی تھی۔ مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ مہاجر پنجابی پٹھان محاذ کے کنوینر نے اپنی زندگی میں قومی زبان کی کوئی خدمت نہیں کی۔ صرف یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔ اور یہاں ایک بڑے زمیندار اور نواب ہیں۔ ان اردو کے نادان دوستوں نے جس طرح سے اس وقت اردو کے تحفظ کے نام پر اپنی قیادت کی مہم کو چمکانے کا آغاز کیا ہے ان کا عمل اردو کے خلاف منافرت پیدا کرنا ہے۔ اور سندھ کی سرزمین میں یہ بھی وہی مشن پورا کرنا چاہتے ہیں جو مشرقی پاکستان میں اردو کے دو نادان دوست دیوان وراثت حسین اور منین ہاشمی نے انجام دیئے اور ان کے عمل کا سارا نقصان ان مستقبل کے ہونہار طالب علموں کو پہونچے گا جن کا قصور یہ ہے کہ وہ پیدا تو پاکستان میں ہوئے ہیں مگر ان کے ماں باپ بدقسمتی سے اپنے آپ کو تئیس سال گزر جانے کے بعد بھی مہاجر کہتے ہیں۔ اس نام نہاد محاذ کے عمل نے اس وقت جو اندرون سندھ ایک کشیدگی کو جنم دیا ہے اس کو قومی اتحاد کے پیش نظر جتنی جلدی ہو ختم کر دینا چاہیئے یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ آخر حکومت جس پر امن و امان کی ذمہ داری ہے اس قسم کے افعال کو خاموشی سے کیوں دیکھتی رہتی ہے۔ وہ فرد چاہے وہ نیا سندھی ہو یا پرانا سندھی، کتنا ہی بااثر کیوں نہ ہو۔ اگر وہ کسی بھی طرح بھائیوں میں انتشار پیدا کرے تو وہ قوم ملک کا وفادار نہیں ہو سکتا۔ سندھ کی سرزمین کے کسی بھی حصہ میں یا کسی گاؤں میں جا کر دیکھا جائے جہاں ایک بھی نیا سندھی نہ رہتا ہو، تو وہاں بھی اردو اخبار ضرور ملے گا۔ لیکن آج ایسے بہت سے دیہات مثالاً پیش کئے جا سکتے ہیں جہاں اردو کیا سندھی اخبارات بھی نوجوان طبقہ کے پاس ملیں گے۔ آج ایسے مقامی سندھیوں کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جنہوں نے اردو کی بہت خدمات انجام دی ہیں۔ اس وقت ملک کی سلامتی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم بلا تفریق مہاجر، انصار اس قسم کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کریں اور ایسے افراد کو جو انتشار کا سبب ہوں اپنے معاشرے سے باہر نکال پھینکیں۔

سردارِ قیوم نے انتخابات جیت کر عمدہ نوکری حاصل کرلی

ابن الحکیم

تحریکِ المجاہد سردار قیوم کا "الیکشن اسٹنٹ" تھی

آزاد کشمیر میں آج کل جو سیاسی صورتِ حال ہے وہ ان عناصر کے لئے سخت حوصلہ شکنی کا باعث ہے جو مقبوضہ کشمیر کی آزادی کے لئے اپنی جانیں ہتھیلی پر لئے ہوئے ہیں کشمیر کے اس حصے میں جو آزاد کشمیر کے نام سے موسوم ہے، سیاسی فضا اس قدر مسموم ہے کہ اس کی حدود میں کشمیر کی آزادی کا خواب دیکھنا بھی حماقت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا نوکر شاہی نے ایکٹ ۱۹۷۰ء کی تلوار گردنوں پر لٹکا کر جن انتخابات کا ڈھونگ رچایا تھا اس کے نتائج بھی وہی نکلے جن کی نوکر شاہی اور سرمایہ داروں نے خواہش کی تھی۔ ان انتخابات میں اقتدار کے بھوکے، عوام کا خون چوسنے والے، ملک و قوم کی آزادی کا سودا کرنے والوں نے دھن، دھونس اور دھاندلیوں سے پوری طرح کام لیا۔ اور آزاد کشمیر میں مذہب کا نام لے کر استحصالیوں کو پناہ دینے والی آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کو کامیاب کرانے کے لئے ہر ممکن ذرائع استعمال کئے۔

آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس اور جماعتِ اسلامی کے درمیان جو تعلقات ہیں ان کا اندازہ اس امر سے بھی بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۲ر نومبر ۱۹۷۰ء کو مظفر آباد میں سردار عبدالقیوم خان کی جو رسمِ تاجپوشی ادا کی گئی تھی اس میں جماعت کے مولانا فتح محمد کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا اور وہ اس محفل کی جان بنے ہوئے تھے۔ جماعتِ اسلامی نے مسلم کانفرنس کی صدارت میں آزاد کشمیر کے اندر اپنا ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا ہے۔ اب وہ بڑی تیزی سے آزاد کشمیر کے علاقے گلگت و بلتستان کے ان ستم رسیدہ عوام میں اثر و رسوخ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے جنہیں اب تک بھیڑ بکریوں کی طرح سمجھا جاتا رہا ہے اور جنہیں آزاد کشمیر یا پاکستان کہیں بھی ووٹ تک دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔

آزاد کشمیر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ۳۰ر اور ۳۱ر اکتوبر ۱۹۷۰ء کو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر صدارتی اور قانون ساز اسمبلی کے جو انتخابات منعقد ہوئے ان میں سرکاری اطلاعات کے مطابق تقریباً تین لاکھ افراد نے اپنے حقِ رائے دہی استعمال کیا۔ عوام کی ایک بہت بڑی تعداد نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا اور اپنا یہ حق استعمال کرنے سے گریز کیا۔ ۱۰ر نومبر ۱۹۷۰ء کو سرکاری طور سے سردار عبدالقیوم خان کی کامیابی کا اعلان کیا گیا اور ۱۲ر نومبر ۱۹۷۰ء کو انہوں نے آزاد کشمیر کے صدر کی حیثیت سے حلفِ وفاداری اٹھایا۔ اپنی پوری انتخابی مہم کے دوران سردار صاحب نے آزاد کشمیر کے عوام سے جو وعدے کئے ان میں کشمیر کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے کے مسئلے کو فوقیت دی۔ اوّلیت اور اس کے لئے اپنے بیان کا سارا زور صرف کر دیا لیکن آئینی حدود میں رہ کر آزادیٔ کشمیر کا خیال کرنا آزادیٔ کشمیر کی لگن رکھنے والوں کے لئے ایک حماقت بن گیا ہے۔ بلکہ یہاں تک کہ اب تو شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ جو مسئلہ کشمیر کے آئینی حل پر سب سے زیادہ زور دیتے رہے، آجکل وہ بھی اسے ایک لغویات سمجھتے ہیں۔ موجودہ دور میں مسئلہ کشمیر کا حل محض مسلح جدوجہد ہی ہے۔ تو پھر مسلح جدوجہد کا آغاز کس طرح سے کیا جا سکتا ہے۔؟ اور کیا مسلح جدوجہد صرف کشمیری عوام تک ہی محدود رہنی چاہیئے۔ یا پاکستان بھی اس میں برابر کا شریک ہوگا؟ لیکن پچھلی دو جنگوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پاکستان بھارت سے جنگ کر کے کبھی بھی کشمیر کو آزاد نہیں کرا سکتا۔ اس لئے قرعۂ فال کشمیری عوام کے نام پر ہی پڑتا ہے۔

عوام کی مسلح جدوجہد پر سردار صاحب بھی ایمان رکھتے ہیں، چنانچہ اسی باعث انہوں نے انتخابی مہم کے دوران "تحریک المجاہد" کا اعلان کیا۔ اس تحریک کے نام پر سردار صاحب نے پاکستان کے اسلام پسند، مزدور دشمن سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں سے بڑی بڑی رقمیں، چندے کے طور پر وصول کیں۔ سننے میں آیا تھا ان نام نہاد اسلام پسندوں نے "تحریک المجاہد" کے نام پر چندہ محض اس خوش فہمی کی بناء پر دیا تھا کہ "تحریک المجاہد" کی بیل منڈھے چڑھے گی تو دیکھا جائے گا۔ انہیں یہ خوش فہمی بھی تھی کہ یہ مجاہد ان کارخانہ داروں کے کارخانوں کو مزدوروں کے گھراؤ اور جلاؤ سے ضرور بچا لیں گے۔ لیکن "المجاہد" کے نام پر اکٹھا ہوا اور لاکھوں روپیہ صرف سردار

الفتح

صاحب کی انتخابی مہم میں کام آیا۔ اور مسلح جدوجہد کی راہ تکنے والے، بندوقوں کا انتظار کرنے والے بازوؤں کو یہ کہہ کر مطمئن کراتے رہے کہ سردار صاحب ذرا انتخابات سے نمٹ لیں۔

صدارتی انتخابات میں جہاں "المجاہد" کے نام پر لیا گیا چندہ خوب کام آیا وہاں "تحریک المجاہد" کے اس اسسٹنٹ نے بھی خاصا کام کیا۔ چنانچہ صدارتی انتخابات میں کامیابی کے بعد "تحریک المجاہد" کو سردار صاحب نے مصلحت کے سرد خانے میں ڈال کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ تحریک واقعی ایک اسسٹنٹ تھی۔ آزاد کشمیر کے انتخابات سے پیشتر آپ ہر روز اخبارات میں "تحریکِ المجاہد" کے الفاظ دیکھتے تھے۔ مگر سردار صاحب کی کامیابی کے بعد یہ الفاظ محض ایک خواب بن گئے ہیں۔

سردار عبدالقیوم خان نے "تحریک المجاہد" کے نام پر جہاں پاکستانی اسلام پسند سرمایہ داروں سے چندہ وصول کر کے پاکستانی عوام کی دشمنی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے وہاں انہوں نے حدِ متارکہ جنگ کے نزدیک رہنے والوں کی زندگی بھی اجیرن کر دی ہے اور ان کشمیریوں پر بھارتی درندوں نے مشقِ ستم اور تیز کر دی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ "تحریک المجاہد" کا کہیں وجود ہی نہیں۔ لیکن بھارتی ظالموں نے اسے حقیقت سمجھ کر مقبوضہ کشمیر کے رہنے والوں پر عرصۂ حیات مزید تنگ کر دیا ہے۔ انتخابات کے بعد سردار صاحب نے "المجاہد" کا نام لینا کیوں چھوڑ دیا ہے؟ شاید اس لئے نہیں کہ اب وہ اس نام نہاد گوریلا تنظیم کو خفیہ طور پر چلانا چاہتے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ "ایکٹ ۱۹۷۰ء" کا پھندۂ غلامی انہیں اس کا نام لینے سے منع کرتا ہے۔ سردار صاحب اب کس منہ سے المجاہد کا نام لیں جب کہ ایکٹ ۱۹۷۰ء جیسے رسوائے زمانہ دستاویزِ غلامی کو قبول کر کے انہوں نے جہاد نہ کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ یہ ایکٹ ۱۹۷۰ء جو پاکستان کی نوکر شاہی نے آزاد کشمیر کے عوام کے جذبۂ آزادی کو کچلنے کے لئے ان پر نافذ کیا ہے، اور جس کے تحت سردار صاحب نے صدارتی انتخاب جیتا ہے اس کی ایک شق یہ بھی ہے کہ آزاد کشمیر کی حکومت کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتی جس سے پاکستان کی بین الاقوامی ذمہ داریاں زد میں آئیں۔ مزید یہ کہ ایکٹ ۱۹۷۰ کی کسی بھی شق میں صدر آزاد کشمیر یا آزاد کشمیر کی قانون ساز اسمبلی ترمیم نہیں کر سکتی۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر تحریک المجاہد یا آزادیٔ کشمیر کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ دوسرے لفظوں میں اگر یہ کہا جائے کہ سردار صاحب نے اپنی معمولی سی تعلیمی قابلیت کے ساتھ، ایکٹ ۱۹۷۰ء کے تحت انتخابات جیت کر ایک عمدہ نوکری حاصل کر لی ہے۔ جو بیروزگاری کے اس زمانے میں بہت ہی غنیمت ہے تو یہ حقیقت کے زیادہ قریب ہوگا۔

سرکاری اداروں کی کمی سے نجی کالج اور اسکول شہر کی ایک بڑی ضرورت بن گئے ہیں اس ضرورت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں نے لوٹنے کا ایک نیا ذریعہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ بیشتر اداروں نے بد عنوانیوں کی اعلیٰ مثالیں قائم کی ہیں۔ ہم ایسی تمام بد عنوانیوں کا احتساب کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ نیشنل کالج پر یہ مضمون اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

نیشنل کالج کی انتظامیہ نے

سرکاری امداد اور اسٹوڈنٹس فنڈ کو بڑے پیمانے پر خرد برد کیا ہے

اشرف شاد

کراچی میں متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے اکثریت سے آباد ہیں۔ تعلیم اس طبقے کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اسی بڑھتی ہوئی ضرورت نے کراچی میں تعلیم کے تاجروں کی ایک بڑی کھیپ پیدا کردی ہے جو امدادِ باہمی کی طرز پر سوسائٹیاں بنا کر ہیرا پھیری سے کچھ پیسہ جمع کرتی ہیں اور پھر سرکاری خزانے سے امداد کے نام پر رقم بٹور کر اپنا کاروبار چمکاتی ہے۔ ساتھ ہی ماہرینِ تعلیم کا لقب حاصل کرکے اپنے سروں پر علم وفضل کی دستار سجاتی ہیں اور اپنے گرد وقار و متانت کے خول چڑھائے سرفرازی حاصل کرنے کی حقدار بن جاتی ہے۔

تعلیم کے ان وڈیروں نے مختلف سائن بورڈ لگا کر اپنے اپنے کھیل رچا رکھے ہیں۔ وہ فیسوں کی مد میں اضافہ کرکے متوسط طبقے کے ان والدین کی کمر توڑتے ہیں جن کے "سپوت" اس بورژوا سماج میں بہتر سے بہتر مقام حاصل کرنے کی جستجو میں ڈگریاں خریدنے ان کی دکان میں داخل ہوتے ہیں اور کچھ ادھ کچے اور ادھ پکے ذہنوں میں علم وشعور کی رو دوڑانے سے زیادہ تعلیم کے یہ وڈیرے ہوشیار دوکانداروں کی طرح ان کی جیب سے زیادہ سے زیادہ نکلوانے کی فکر میں غلطاں وپیچاں اپنی کاروباری سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔

ان وڈیروں میں سب سے زیادہ شہرت اے۔ ایم قریشی نے حاصل کی تھی اور انہی کی پیروی میں دوسرے بہت سے لوگوں نے بھی اپنے کاروبار چمکائے لیکن قریشی ایک سیاستداں بھی تھا اور سیاست میں اس کے زوال نے اس کی تعلیمی دوکان سے بھی اس کا بوریا لپیٹ دیا۔ اے۔ ایم قریشی کے علاوہ دو چار اور حضرات کے ناموں کا بھی خوب شہرہ ہوا۔ لیکن قریشی نے جو نقشِ قدم چھوڑے تھے ان پر ذرا سنبھل کر چلنے والے وہ لوگ جنہوں نے ذرا ہوشیاری سے اپنا کاروبار کیا اور سیاست وغیرہ کے چکر میں نہ پڑے اپنی پگڑیاں سنبھال گئے۔ لیکن ہم سیاست صحافت، محنت اور تعلیم غرض ہر میدان میں بدعنوان افراد کی پگڑیاں اتارنے کا عزم کئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا تعلیمی وڈیروں کی درپردہ بدعنوانیاں بھی ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ہمارے ہاتھ ہر ایسے ہر سر سے کلاہ اتارنے کے لئے بہت طاقتور ہیں جن کا شعار موقع پرستی اور مطلب پرستی ہے۔ نیشنل کالج کے سلسلے میں یہ مضمون اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ نیشنل کالج کے کرتا دھرتا محترم حسن عادل ہیں۔

گزشتہ دنوں اخبارات میں اس وقت ان کا نام بہت اچھلا جبکہ انہیں کالج کے ایک محترم پروفیسر نہال رضوی صاحب کے ساتھ ان کے انسانیت سوز سلوک کی داستانیں طشت ازبام ہوئیں اور جن پر علم ودانش کے اسباق پڑھانے والے ایک استاد کی ذہنی حالت ان مدارج پر جا پہنچی جب کہ اسے برسرِ عام تیل چھڑک کر خودکشی کرنے کے انتہائی اقدام کا اعلان کرنا پڑا۔ یہ اعلان اگر اپنے انجام کو پہنچ جاتا تو شاید تاریخ میں ایک کربناک المیے کا اضافہ کر جاتا۔

نجی کالجوں کے بارے میں کچھ عرصہ قبل مارشل لاء حکام نے ایک تحقیقاتی کمیٹی (PROBE COMMITTEE) قائم کی تھی جس نے مختلف کالجوں کے بارے میں تفصیلی طور پر تحقیقات کی تھیں۔ ان کے عملے، اکاؤنٹ، تعلیمی مسائل اور دوسرے تمام امور کی چھان بین کی تھی۔ اس کمیٹی نے جو رپورٹیں پیش کیں ان کا کیا ہوا۔ ان پر کیا اقدامات ہوئے یہ کچھ نہیں معلوم۔ تاہم اس کمیٹی نے نیشنل کالج کے بارے میں جو رپورٹ تیار کی تھی اس میں اس نے نیشنل کالج کی انتظامیہ کو حسب ذیل بدعنوانیوں کا مرتکب قرار دیا تھا:

ا: بوگس اکاؤنٹنگ۔

ب۔ فرنیچر کے اکاؤنٹ میں غیر قانونی ادائیگیاں۔

ج: اسٹوڈنٹس فنڈ کا غیر قانونی استعمال۔

د: کالج فنڈز میں خرد برد

ہ: سرکاری امداد سے ملنے والی رقم کی بچت

و: ذاتی مقاصد کے لئے کالج فنڈز کا استعمال۔

ز: مفروضہ اسٹاف کے نام پر تنخواہیں ظاہر کرکے حکومت کے ساتھ فراڈ۔

کمیٹی نے اپنی تفصیلی رپورٹ کے آخر میں نتائج اخذ کرکے مزید لکھا تھا:۔

"درحقیقت یہ انتہائی سنگین معاملہ ہے لیکن کنٹرولنگ اتھارٹیز بشمول کراچی ڈائرکٹریٹ ان جرائم سے آگاہ نہیں ہے اور انتظامیہ سے ابھی تک کسی قسم کی وضاحت کا مطالبہ بھی نہیں کیا جا سکا ہے۔"

طلبا کے فنڈز کے تقریباً ڈھائی لاکھ روپے غلط طریقے سے استعمال کئے گئے

کالج کی انتظامیہ پر کالج کے فنڈز کو خورد برد کرنے حکومت کے ساتھ فراڈ کرنے اور ایسے ہی دوسرے الزامات کی تحقیقات ہونے کے باوجود کمیٹی یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہے کہ کنٹرولنگ اتھارٹیز اس سلسلے میں اس قدر کوتاہ نظر کیوں ہیں اور اس قسم کی بدعنوانیوں کی اس قدر کھلی اجازت کیوں ہے۔

کمیٹی نے اپنی تفصیلی رپورٹ میں کالج سے متعلق امور کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے اس کے مختلف حصے ہم ذیل میں شائع کر رہے ہیں:۔

نیشنل کالج (قائم شدہ ۱۹۵۶)

یہ کالج جیل روڈ پر واقع ہے۔ اس کی پشت پر مختلف ہاؤسنگ سوسائیٹیوں کی کثیر آبادی ہے۔ اس کی صبح اور شام کی دو شفٹوں میں ۳ ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ اس کی عمارت کالج کی اپنی ملکیت ہے لیکن یہ جگہ طلباء کی تعداد کے مقابلے میں بہت کم ہے اور ان کی ضروریات کے لئے قطعی ناکافی ہے۔ فرسٹ کلاس نرخ رکھنے والے ایک کالج کے لئے اتنی جگہ کسی طور پر بھی مناسب نہیں ہے۔

گورننگ باڈی

گورننگ باڈی کے اختیارات میں اس کے اپنے دستور کے مطابق حسب ذیل شقیں بھی شامل ہیں:۔

ا: اخراجات کو ایک مد سے دوسری مد میں منتقل کرنا۔

ب: پرنسپل کی رپورٹ پر کالج کے کسی بھی ملازم کے خلاف تادیبی کارروائی کرنا۔

دستور کی یہ دونوں دفعات نہ صرف یونیورسٹی کے قواعد کے خلاف ہیں بلکہ انصاف کی بنیادی قدروں کے بھی منافی ہیں۔ (الف) کے تحت جو اختیارات دیئے گئے ہیں اس کے تحت کالج کے قیام سے لے کر اب تک فنڈز کا غلط استعمال ہوتا رہا ہے۔ پرنسپل کی رپورٹ پر کسی شخص کے خلاف تادیبی کارروائی بھی انتہائی بے معنی اور لغو ہے۔ اس کے تحت ہمیشہ ایسے ملازمین کو جن کے خلاف الزامات عائد کئے گئے دفاع کے حق سے بھی محروم رکھا گیا جس کے نتیجے میں ماضی میں کئی اساتذہ کو سرسری طور پر ہی برطرف کر دیا گیا۔

فیس اور فنڈز

فیس اور مختلف مدوں میں جو رقوم طلبہ سے وصول کی جاتی ہیں ان میں طلبہ سے ٹوٹ پھوٹ کی مد میں ۲۵ روپے وصول کئے جاتے ہیں حالانکہ اس سلسلے میں جو قواعد ہیں ان کے مطابق یہ رقم "لیب ڈیپازٹ" کے طور پر وصول کی جاتی ہے اور سال کے اختتام پر طلبہ سے ہونے والی ٹوٹ پھوٹ کے اخراجات وضع کر کے یہ رقم واپس کر دی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے تمام اچھے کالجوں میں ٹوٹ پھوٹ کی ایک باقاعدہ فہرست مرتب کی جاتی ہے۔ اس امر کا کوئی جواز موجود نہیں ہے کہ چند طلبہ کے ہاتھوں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ کا خمیازہ تمام طلبہ ۲۵ روپے سالانہ کی صورت میں بھگتیں۔ میڈیکل فیس ایک روپیہ ماہانہ وصول کی جاتی ہے جبکہ یہ پچاس پیسے ماہانہ سے زائد نہیں ہونی چاہیئے۔ اسی طرح اسپورٹس فنڈ کی مد میں جو رقوم وصول کی جاتی ہیں وہ قاعدے کے مطابق نہیں ہیں اس لئے اسپورٹس فنڈ اسٹوڈنٹس فنڈ کے طور پر علیحدہ وصول کر لیا جاتا ہے۔

طلبہ کے فنڈز کا کوئی علیحدہ حساب نہیں رکھا گیا ہے اور اسے آمدن کے مرکزی حصے میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ قواعد کی صریح خلاف ورزی ہے اور سخت بددیانتی ہے۔

(۱) عملہ ۴۵ اساتذہ پر مشتمل ہے۔ ان میں کوئی بھی پروفیسر نہیں ہے۔ اسسٹنٹ پروفیسر بھی صرف چند ایک ہیں۔ اس معیار اور نرخ کے کالج میں ہر مضمون میں کم از کم ایک پروفیسر کا تقرر لازمی ہے۔ جس طرح کہ ایس ایم کالج میں ہے۔ کالج کی مالی حالت اس بار کی آسانی سے متحمل ہو سکتی ہے۔

(۲) بورڈ کی منظوری کے مطابق "ایگریمنٹ فارم" یہاں ابھی تک جاری نہیں کئے گئے ہیں۔

(۳) شفٹوں کی تعداد اور بڑی بڑی کلاسوں کے مقابلے میں اساتذہ کی تعداد بہت کم ہے جس کی وجہ سے موجودہ اساتذہ پر کام کا بوجھ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اور اس طرح کالج کی کارکردگی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ بعض مضامین کی مقررہ کلاسیں تک نہیں لگ سکیں۔

(۴) اساتذہ کے حالات کار انتہائی غیر تسلی بخش ہیں۔ اساتذہ کو ملازمتوں کا کوئی تحفظ حاصل نہیں۔ اور انہیں بسا اوقات کھڑے کھڑے چلتا کر دیا جاتا ہے۔ (اس سلسلے میں گورننگ باڈی کے ضمن میں بھی کمیٹی اپنے تاثرات لکھ چکی ہے۔)

(۵) پراویڈنٹ فنڈ اور تعطیلات کی سہولتیں یونیورسٹی کے مقررہ قواعد کے مطابق اساتذہ کو حاصل ہیں لیکن اس سلسلے میں خلاف ورزی کی مختلف شہادتیں ملی ہیں۔ یونیورسٹی کے قواعد پر قطعاً دیانت داری کے ساتھ عمل درآمد نہیں کیا گیا۔

لائبریری

لائبریری کی حالت بھی افسوسناک ہے۔ اس میں جتنی کتابیں ہیں وہ ایک ڈگری کالج کی حیثیت کے منافی ہیں۔ ۱۲ سالوں میں ۱۴ ہزار کتابوں کی لائبریری کسی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں ہے۔ جبکہ ان بارہ ہزار کتابوں میں سے بھی زیادہ تر غیر ملکی اداروں نے عطیہ کے طور پر دی ہیں۔ ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۶۶ء سے لے کر ۱۹۶۹ء تک

پرنسپل نے اپنی ذاتی استعمال کی کار کالج کے فنڈز سے خریدی

یتین سالوں جب لائبریری میں صرف ۱۰۹۵ کتابوں کا اضافہ ہوا ہے۔ عام مطالعہ کے لئے کتابیں کافی ہیں لیکن طلبہ کی نصابی ضروریات کے متعلق کتابیں قطعاً" ناکافی ہیں۔

اس سلسلے میں کمیٹی اس حقیقت کی نشاندہی بھی کرنا چاہتی ہے کہ معائنہ کے دوران میں رجسٹر میں ۹۷۰۰ نمبر سے کر ۹۷۰۲ نمبر تک یعنی ۵، ۵ کتابوں کا اندراج غلط ملط سا ہے اور ان کے واؤچرز میں بے قاعدگیاں کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں مزید تحقیقات کی ضرورت ہے۔

امورِ طلبہ

طلبہ نے عموماً اپنے امور کے سلسلے میں اطمینان کا اظہار کیا۔ تاہم یہ ایک عام شکایت تھی کہ ان کی سوسائیٹیوں کو، جس کے لئے فنڈز بھی لئے جاتے ہیں کام کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

اسٹوڈنٹس فنڈز کا حساب کتاب دیکھنے پر پتہ چلا ہے کہ اس میں بڑے پیمانہ پر گھپلے کئے گئے ہیں اور انہیں غلط طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں تفصیلی رپورٹ مالیات کے ضمن میں پیش کی جا رہی ہے۔

مالیات

کالج کی مالی حالت بہت اچھی ہے۔ ۲۵ ہزار روپے کے ریزرو فنڈز کے علاوہ کالج کے حسابات لاکھوں روپے کی بچت ظاہر کرتے ہیں یہ رقم کس طرح بچائی اور جمع کی گئی ہے۔ یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں انتظامیہ کی ایک دھوکہ دہی ہمارے نوٹس میں بھی آئی ہے۔

نیشنل کالج کی انتظامیہ نے ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن کو اپنے عملے کی تنخواہوں کا ایک واؤچر پیش کیا تھا۔ اس میں ۱۷ ایسے اساتذہ کے نام بھی شامل تھے جن کا کالج میں کوئی وجود نہیں تھا اور ان کی تنخواہیں ۲۵۰ روپے سے لے کر ۴۵۰ روپے ... حکومت کے ساتھ فراڈ کرنے کی ایک ناپاک سازش تھی۔ اس کا سراغ ویسٹ پاکستان ٹیچرز ایسوسی ایشن نے لگایا تھا جس پر ان بوگس اساتذہ کی تنخواہوں کی ادائیگی روک لی گئی تھی۔ ہمارے علم میں یہ بات بھی ہے کہ اس قسم کے طریقہائے کار گزشتہ دنوں میں بار بار اختیار کئے گئے تھے اور اس کا مقصد سرکاری امداد کا حساب کتاب برابر کرنا تھا جو ایک انتہائی غیر منصفانہ اقدام ہے۔ اس قسم کے غیر دیانتدارانہ طریقوں کی حوصلہ افزائی یقیناً ایک گھناؤنا فعل ہے۔

اکاؤنٹس

کالج کے اکاؤنٹس کے بارے میں حسب ذیل بیان کمیٹی کے ایک رکن مسٹر طاہر نے تیار کیا ہے۔ یہ بیان بھی اپنے اندر کئی دلچسپ باتیں لئے ہوئے ہے:

کالج کا فرنیچر پاک فرنیچر ہاؤس دکان نمبر ۱۵ مبارک مسجد، بارٹن روڈ کراچی سے خریدا گیا تھا۔ فرنیچر واؤچرز کی فائل میں سے دو طرح کے کیش میمو/ بل برآمد ہوئے۔ ان میں سے ایک سبز رنگ کا اور انگریزی میں طبع شدہ تھا جبکہ دوسرا بادامی رنگ میں اردو میں چھپا ہوا تھا۔ بادامی رنگ کا کیش میمو/بل مشکوک تھا اس لئے اس پر ترتیب وار نمبر ۱۷۰، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۵ اور ۲۲۳ (۱۹۶۵-۶۶ء) درج تھے۔ یہ بے قاعدگی ایک بڑی بدعنوانی کی نشاندہی کرتی ہے۔

اسٹوڈنٹس فنڈ

اسٹوڈنٹس فنڈز کا اکاؤنٹ بھی انتہائی مشکوک ہے۔ واؤچر فائل میں بڑی تعداد میں بوگس واؤچر شامل ہیں اور ان میں اسپورٹس میگزین سوسائٹیز، یونین اور ریڈنگ روم کے ضمن میں مختلف اخراجات ظاہر کئے گئے ہیں۔ ان بوگس واؤچرز کو تیار کرنے کے سلسلے میں سنگین بدعنوانیاں اور بے قاعدگیاں کی گئی ہیں۔ مزید برآں ۱۹۶۴-۶۵ء کے تعلیمی سال کے اسٹوڈنٹس فنڈز کا کوئی حساب نہیں ملتا۔ اس سال میں کالج کی انتظامیہ نے شاید کوئی خصوصی کارنامے انجام دیئے تھے کیونکہ اس سال کی بہت سی چیزیں غائب ہیں جن میں اسٹوڈنٹس فنڈز کا اکاؤنٹ بھی شامل ہے۔

اسٹوڈنٹس فنڈز کے سلسلے میں کالج نے وصولیابی اور ادائیگی کے جو کھاتے تیار کئے ہیں ان سے آمدن و اخراجات کے تجزیہ کے مطابق کالج کی انتظامیہ نے ۳۰ جون ۱۹۶۸ء تک یونین، سوسائیٹیز، میڈیکل، گیمز، ریڈنگ روم میگزین اکاؤنٹس اور کاشن منی کے تمام فنڈز سے دو لاکھ ۲۲ ہزار ایک سو ۹۴ روپے خورد برد کئے

کار کی غیر قانونی خریداری

مسٹر حسن عادل نے ۸ ہزار ۶ سو روپے کی کار خریدی۔ کار کی خرید کا یہ خرچ کالج کے اخراجات میں شامل کیا گیا۔ ۱۹۶۰-۶۱ء کے مالی سال کے دوران میں کالج کے کیش اور لیجر اکاؤنٹس کے اندراجات سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مسٹر حسن عادل نے نہ تو یہ رقم کالج کو واپس کی اور نہ ہی اکاؤنٹس میں یہ رقم مسٹر حسن عادل کے نام قرضے کے طور پر درج کی گئی۔ مسٹر حسن عادل نے اس بات کا اعتراف کیا کہ انہوں نے یہ کار اپنے ذاتی استعمال کے لئے خریدی تھی اور ۸ ہزار ۶ سو روپے کالج کے فنڈز سے ادا کئے تھے انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ ان میں سے ۲ ہزار روپے انہوں نے واپس کر دیئے ہیں لیکن جب اکاؤنٹس کے ریکارڈ سے ان کے اس بیان کی تصدیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ انہوں نے ۲ ہزار

روپے واپس نہیں کئے تھے بلکہ یہ رقم ان کے نام قرضے کے طور پر مندرج ہے۔

سرکاری امداد میں خرد بُرد

کالج کو ۶۴-۱۹۶۳ء کے دوران میں ایک کھیل کے میدان کو ٹھیک کرنے کے لئے کالج کے واسطے پانچ ہزار روپے کی خصوصی امداد منظور کی گئی۔ اس دوران میں کالج کے پاس کھیل کا کوئی میدان نہیں تھا۔ کالج کے حکام کا بیان ہے کہ انہوں نے یہ رقم کرکٹ، والی بال اور دوسرے آؤٹ ڈور گیمز کی پریکٹس کے لئے کالج کے کمپاؤنڈ کے گراؤنڈ کی سطح ہموار کرنے اور اس میں مٹی وغیرہ بھرنے پر خرچ کی لیکن کالج کے حکام اپنے اس بیان کی شہادت میں کوئی ایسا واؤچر بھی پیش نہ کر سکے جس سے ان اخراجات کی توضیح ممکن ہو سکتی۔ سرکاری آڈیٹر نے بھی اس سلسلے میں یہ ریمارکس دیئے تھے کہ کیش بک میں اس رقم کا کہیں بھی اندراج موجود نہیں ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ

پراویڈنٹ فنڈ کے سلسلے میں مختلف بے قاعدگیوں کی رپورٹ بھی ملی ہے۔ اس سلسلے میں عدالت میں نیشنل کالج اور ایک سابق لیکچرر کے درمیان ایک مقدمہ بھی زیرِ سماعت ہے۔ انتظامیہ نے سات ہزار این آئی ٹی یونٹ بھی پیش کئے اور بتایا کہ ان کی مالیت ۹۴ ہزار پانچ سو روپے ہے اور یہ پراویڈنٹ فنڈز انوسٹمنٹ ہے۔ یہ این آئی ٹی یونٹس مسٹر حسن عادل، پرنسپل نیشنل کالج کے نام ہیں۔ یہ بھی ایک غیر قانونی اقدام ہے اور دھوکا دہی کے مترادف ہے۔

پراویڈنٹ فنڈز انوسٹمنٹ لازمی طور پر ٹرسٹیز کے نام ہونا چاہیئے نہ کہ ایک فرد کے نام۔ یہ یونٹس یکتا و تنہا مسٹر حسن عادل کے نام ہونے سے انہیں یہ موقع فراہم کر سکتے ہیں کہ وہ اس پراویڈنٹ فنڈ انوسٹمنٹ کو ذاتی جائیداد کی طرح اپنے مفادات کے لئے استعمال کر سکیں۔

اس پوری رپورٹ کے بعد کمیٹی نے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ ہم پہلے ہی درج کر چکے ہیں۔ نیشنل کالج اور اس کے کرتا دھرتا مسٹر حسن عادل کے بارے میں یہ ہماری نہیں بلکہ اس تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ ہے جس نے کالج کے ایک ایک کاغذ کی چھان بین کر کے یہ نتائج اخذ کئے ہیں۔ اس کے علاوہ یو۔ ایس ایڈ کے تحت ملنے والی گرانٹ سے سائنسی آلات درآمد کرنے اور پھر انہیں خرد برد کرنے کی داستان بھی بڑی دلچسپ ہے جو ہم پھر کبھی بیان کریں گے۔

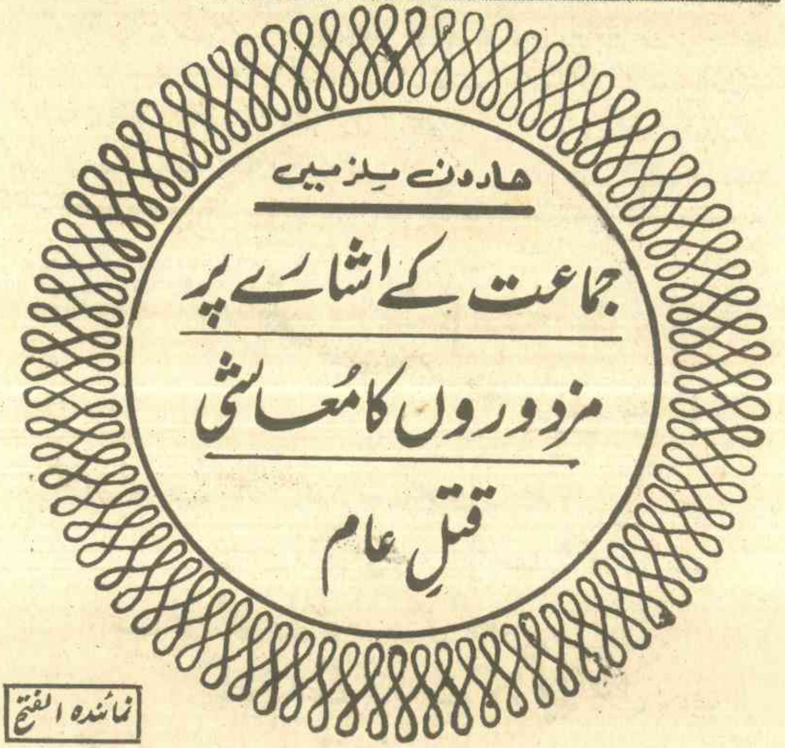
بقیہ: مسٹر بھٹو! خبردار

صوبوں میں ہونا ہے۔ نیشنلائزیشن کا مرحلہ تو اقتدار کی منتقلی کے بعد آئے گا۔ لیکن زمینداروں اور صنعتکاروں نے ابھی سے اس سے بچاؤ کی سکیمیں شروع کر دی ہیں۔ بینکوں نے اپنے کوآپریٹو بینکوں کو چالو کر دیا ہے۔ بڑے بڑے صنعتکار اقتصادی ماہرین کے مشوروں سے بہت سی تبدیلیاں لا رہے ہیں۔ حکومت نے درآمدی پالیسی میں کاروں اور سامانِ تعیش پر پابندی لگا کر راستہ روکنے کی کوشش کی ہے۔ صنعتکاروں نے بیرونِ ملک سرمائے کی ترسیل کے انتظامات کر لئے ہیں۔

ایسے حالات میں انتقالِ اقتدار کے مرحلے تک صبر کرنا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ ان تمام سازشوں اور چور دروازوں پر نگرانی کی کڑی ضرورت ہے۔ ان کی نگرانی افراد نہیں کمیٹیاں کر سکتی ہیں۔ ان کمیٹیوں کی تشکیل وزارتوں کے محکموں کے اعتبار سے ہونی چاہیئے تاکہ اس عرصے میں جس قدر کام ہو وزارتیں بنتے ہی اس کے عملی نتائج سامنے آنے لگیں۔

موجودہ حکومت باز رہے

اس کے علاوہ ان کمیٹیوں کا فوری فرض یہ ہے کہ ایسے مسائل جو ہنگامی نوعیت کے ہیں اور جو عوام پر براہِ راست اثر انداز ہو رہے ہیں مثلاً اشیائے خوردنی کی مہنگائی، پٹرول کا ٹیکس — ایسے مسئلوں پر ان کمیٹیوں کو موجودہ حکومت سے دو ٹوک بات کرنی چاہیئے کہ اگر وہ مسائل حل کرنے کا اختیار نہیں رکھتی تو اسے مسائل پیدا کرنے سے بھی باز رہنا چاہیئے۔ اسے نئے ٹیکس لگانے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ان نگران کمیٹیوں کی عملی کارکردگی اور ہوشیاری ہی بیوروکریسی اور دوسری دوسری عوام دشمن طاقتوں کو سازشوں سے باز رکھ سکتی ہے۔ یہ نگران کمیٹیاں — پارٹی اور عوام کے درمیان رابطہ کا کام بھی دیں گی۔ کہ اگر عوام کو غلط طور پر الجھا کر احتجاج پر آمادہ کیا جا رہا ہے تو یہ رابطہ کمیٹیاں انہیں باز بھی رکھ سکیں۔ عوام کو سڑکوں پر لانا یا واپس لے جانا ان کمیٹیوں کے بس میں ہی ہو سکتا ہے۔ یہ بات اسی تنظیمی فقدان کی مظہر ہے کہ عوام کے منتخب نمائندوں کی پالیسی کے برعکس عوام سڑکوں پر نکل آتے اور رجعت پرست طاقتوں کی سازشوں کا شکار ہوتے



نمائندہ الفتح

ہارون ٹیکسٹائل ملز میں جماعت اسلامی اور ملز کی انتظامیہ کی ملی بھگت مزدوروں کے لئے ایک عذاب بن گئی ہے - اس عذاب کی زد میں آکر اب تک متعدد مزدور اپنے روزگار سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور بعض ملازموں کے سروں پر غنڈوں کی مسلح سرگرمیوں کا خوف ہر وقت مسلط رہتا ہے - ملز کی یونین کا اس کے عہدیداروں نے مزدوروں کی مرضی کے بغیر جماعت کی ذیلی تنظیم نیشنل لیبر فیڈریشن سے الحاق کر دیا تھا اور اس کے بعد سے اس نے مزدوروں سے جمع ہونے والے چندوں کو خرد برد کرنے، انتظامیہ سے میل جول بڑھانے اور اپنے مخالف مزدوروں کو ملز کی ملازمت سے برطرف کرانے کے علاوہ کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔

ہارون ملز میں پہلے ورکرز یونین کے نام سے ایک یونین اپنا کام کر رہی تھی۔ لیکن اس کا وجود یا عدم وجود برابر تھا۔ مزدور اس سے تنگ آ چکے تھے انہوں نے بالآخر ۲۰ مارچ ۱۹۶۹ء کو امپلائز یونین بنائی۔ لیکن اسے رجسٹریشن نہیں ملا۔ بعد ازاں دونوں یونین کے درمیان ریفرنڈم ہوا۔ جس میں امپلائز یونین نے اکثریتی ووٹوں سے کامیابی حاصل کی - اس کے بعد یونین کو رجسٹریشن بھی مل گیا۔ یونین کے جو الیکشن ہوئے اس میں محمد عارف صدر اور غلام محمد جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے - اس موقع پر مزدوروں سے وعدہ کیا گیا تھا کہ یونین کا الحاق کسی سیاسی جماعت کے ساتھ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ۱۹۷۰ء میں یونین کا اجلاس بلائے بغیر اس کا الحاق جماعت کی لغل بچی نیشنل لیبر فیڈریشن سے کر دیا گیا۔

نیشنل لیبر فیڈریشن کے اس الحاق کے بعد ہی ملز کے مزدوروں پر مصیبتوں کا نیا دور شروع ہوا اس الحاق کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ ملز میں جماعت اسلامی کا ایک سرگرم کارکن محمود شاہ کلرک کے طور پر کام کرتا تھا۔ یونین کے جنرل سیکرٹری اور صدر اس کے پاس جایا کرتے تھے - وہ انہیں الٹی سیدھی حدیثیں سناتا اور سوشلزم کے خلاف کفر کے فتوے سنا کر سوشلسٹوں کے بارے میں من گھڑت داستانیں بیان کرتا - یونین کے عہدے داروں سے مل کر یونین کا الحاق نیشنل لیبر فیڈریشن کے ساتھ کرانے کا کارنامہ بھی اسی نے انجام دیا۔

نیشنل لیبر فیڈریشن سے الحاق کرنے کے بعد یونین نے سب سے پہلا کام نام نہاد شوکت اسلام کے سلسلے میں کیا۔ یونین کے عہدے داروں سے فیڈریشن کے اکابرین نے اس کے لئے چندہ مانگا اور اس دن کو کامیاب بنانے کے لئے باقاعدہ کام کرنے کا حکم دیا۔ عہدے داران نے یہ چندہ یونین کے فنڈ سے ادا کیا - یونین کا یہ فنڈ مزدوروں نے اپنی قلیل تنخواہوں سے رقم بچا بچا کر جمع کیا تھا۔ لیکن اس میں سے ایک خطیر رقم شوکت اسلام کے جلسے میں چندے کے طور پر دے کر پانی میں بہا دی گئی اور اس کے لئے نہ تو یونین کا اجلاس طلب کیا گیا اور نہ مجلس عاملہ سے اجازت طلب کی گئی۔

۲۰ اگست کو مجلس عاملہ کے دو ارکان انور سعید اور ممتاز کو نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔ جس پر مزدوروں میں سخت اشتعال پھیلا اور انھوں نے ہڑتال کر دی۔ اس ہڑتال میں نیشنل لیبر فیڈریشن نے جو کردار ادا کیا، اس سے مزدوروں کے دل میں جماعت سے نفرت کا لاوا اور ابل پڑا۔ اس ہڑتال کے شروع ہونے کے آٹھ روز بعد فیڈریشن کے صدر ملک محمد شفیع نے ۲۹ اگست کو یونین کے نمائندوں کو اپنے دفتر میں بلایا۔ مزدور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے، نام نہاد مزدور رہنما کے پاس اس موقع پر ملز کی انتظامیہ کے افراد پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے یونین کے نمائندوں کو پند و نصائح سے نوازا اور فرمایا کہ ہڑتال غیر قانونی ہے اس لئے وہ ہڑتال ختم کر دیں۔ ساتھ ہی یہ دلاسا بھی دیا کہ وہ نکالے ہوئے مزدوروں کو دوسری جگہ ملازم رکھا دیں گے۔ چاروناچار واپس آکر یونین کے نمائندوں نے ہڑتال ختم کرا دی۔ ہڑتال کے بعد صورت حال مزید بگڑ گئی - انتظامیہ نے ہڑتال کے دنوں کو رخصت کے ایام میں شمار کیا اور مزید پانچ مزدوروں کو برطرف کر دیا۔ ملک شفیع اس سودے کے پورے پورے پیسے وصول کر چکے تھے۔

ہڑتال میں مزدوروں کو شدید مایوسی کا شکار ہونا پڑا۔ اس کے بعد نیشنل لیبر فیڈریشن سے الحاق ختم کرنے کے لئے مزدوروں نے باقاعدہ آواز بلند کرنا شروع کی۔ لیکن جس طرح جماعت نے مل کی انتظامیہ کے مفادات کا تحفظ کیا تھا اسی طرح انتظامیہ بھی جماعت کے مفادات بچانے کی ضمانت دے چکی تھی۔ لہذا نیشنل لیبر فیڈریشن کے خلاف بات کرنے والے مزدوروں کی عام برطرفی شروع ہوئی جماعت کی غنڈہ فورس کے کارندے حرکت میں آ گئے اور اس کے ساتھ ساتھ یونین کے ہزاروں روپے کے فنڈ پر قبضہ کرنے کے لئے تمام ضروری کارروائیاں مکمل کر لی گئیں۔

اب تک ۴۱ آدمی ڈائنگ کے شعبے سے، ۲۶ آدمی سلک سے اور ۱۲ آدمی امیبرائیڈری سے نکالے جا چکے ہیں۔ ۱۶ر نومبر کو کوم وائنڈنگ سے ۴۰ سے نکالے جا چکے ہیں۔ ۱۶ر نومبر کو کوم وائنڈنگ سے ۴۰ آدمی نکالے گئے ان میں خواتین بھی شامل ہیں اور ان میں سے بہت سے مزدوروں کی مدت ملازمت بارہ بارہ سال سے زیادہ تھی۔

کوم وائنڈنگ کا یہ شعبہ کمپنی کی انتظامیہ کے تحت چلتا تھا۔ لیکن جماعت اور انتظامیہ کے درمیان جو ساز باز ہوئی تھی اس کے تحت جماعت کے ایک پرانے رکن خلیل احمد کو اس کی خدمت کے صلے میں یہ شعبہ ٹھیکے پر دے دیا گیا۔ مزدوروں نے اس پر شدید احتجاج کیا اور کہا کہ وہ ٹھیکے پر کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ لیکن ایسے تمام مزدوروں کو ملازمتوں سے نکال دیا گیا اور ان کی جگہ نئے ملازمین بھرتی کر لئے گئے۔

یونین کے پبلسٹی سیکرٹری عبدالمالک تھے وہ نیشنل لیبر فیڈریشن سے الحاق کے سرکردہ مخالفوں میں سے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے یونین کے عہدیداروں کی بدعنوانیوں اور فیڈریشن کی معرفت سمجھوتہ بازیوں کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کی۔ ۱۷ر اکتوبر کو ہونے والے جنرل باڈی کے اجلاس میں انہوں نے فنڈز کی خرد برد کے خلاف آواز اٹھائی تو اجلاس میں زبردست ہنگامہ ہوا۔ جماعتی غنڈوں کے ہاتھوں پورا جلسہ درہم برہم ہو گیا۔ اس جرم میں عبدالمالک صاحب کو پبلسٹی سیکرٹری کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ اور ان کی جگہ جماعت کے ایک حامی محمود فرخ کو اس عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ مالک صاحب نے جب خلیل ٹھیکیدار کے خلاف آواز اٹھائی اور اس کی زیادتیوں کی نشاندہی کی تو انہیں خلیل ٹھیکیدار نے برطرف کرانے کی دھمکیاں دیں۔ یہ ٹھیکیدار صاحب، یونین کے عہدے داران اور انتظامیہ ایک مثلث بنی ہوئی ہے۔ جو اپنی زد میں آنے والے ہر مزدور کا صفایا کر رہی ہے۔ ۱۳ر نومبر کو یونین کے صدر عارف کو سیکرٹری غلام محمد کے گھر پر ایک دعوت دی گئی۔

باقی صفحہ ۴۲ پر

غزل

باسط عظیم

خزاں نصیب بہاروں کا سلسلہ کیوں ہے
ہمارے ساتھ ہی آخر یہ حادثہ کیوں ہے

ہر ایک لمحہ دکھائے گا درد کی تصویر
گئے زمانے کی جانب تو دیکھتا کیوں ہے

اگر جھوٹ ہی معیارِ صدق ٹھہرا ہے
تو پھر یہ سچ کے خداؤں کو پوچھتا کیوں ہے

خود اپنے آپ کو تو نے بکھیر رکھا تھا
اب اپنے آپ کو آخر سمیٹتا کیوں ہے

کبھی یہ ذکر بھی توہینِ آدمیت تھا
اب ایسے خاک نشینوں کا تذکرہ کیوں ہے

ہزار ترکِ تعلق سہی مگر یہ بتا!
تو میرے بعد مرا حال پوچھتا کیوں ہے

ہمیں پتا ہے کہ کیا عرضِ مدعا ہوگا
ہمارے سامنے تمہید باندھتا کیوں ہے

جب اُس سے کوئی تعلق نہیں عظیم تو پھر
ہماری سمت محبت سے دیکھتا کیوں ہے

ہینڈز اپ! ہتھیار ڈال دو

لاہور ——— سہراب اسلم

ہمیشہ سے اہلِ علم کا تاریخ میں ایک کردار رہا ہے۔ جمہوریت پسند سسرو "CICERO" کا سر، دار کی خشک ٹہنی پر اس لئے لٹکایا گیا کہ اس نے روم کے آمروں کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا۔ سقراط نے زہر کو ہونٹوں سے اس لئے لگایا کہ وہ مروّجہ نظریات کا باغی تھا اور جو درست سمجھتا تھا اس کے اعلان سے کوئی جابر اسے باز نہیں رکھ سکتا تھا لیکن ہمارے دور کا سقراط زہر کا پیالہ خاموشی سے ہونٹوں سے لگانے کو تیار نہیں ہے۔ وہ زہر دینے والے ہاتھوں کو جھٹک دیتا ہے۔ جھٹک ہی نہیں توڑ دیتا ہے، اس لئے کہ آج کا ادیب، عوامی ادیب جو کچھ لکھتا ہے وہ قلم سے نہیں بلکہ نیزے کی انّی کو اپنے خون میں ڈبو کر لکھتا ہے۔ وہ کاغذ پر نہیں زمانے کی، فضاؤں کی اور ایتھر کی لہروں پر اپنے گرم گرم سرخ لہو کی روشنائی سے لکھتا ہے۔ وہ تحریر جو آنے والی نسلوں کو یہ بتائے گی کہ ان کے آبا و اجداد زہر کے پیالوں کو توڑنا جانتے تھے اور ان بازوؤں کو بھی جو علم و دانش کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔

آج جب ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں تو ایشیا کے سب سے بڑے علمی مرکز ——— لاہور میں لوگ ہتھیلیوں پر اپنے لہو کے چراغ رکھ کر جہل و مسطائیت کے اندھیروں میں علم و ہنر، تہذیب و تمدن، آزاد خیالی اور فکری جمہوریت کی روشنی بستی بستی قریہ قریہ پھیلا رہے ہیں۔ جھگڑا بظاہر پی پی ایل کے نکلے جانے والے صحافیوں کی واپسی کا ہے، چھانٹی روکنے اور ملازمتیں بحال کرنے کا ہے مگر یہ اصل جھگڑا نہیں ہے، اصل لڑائی ہے اظہار کی آزادی پر پابندیوں کے خلاف۔ صحافتی مسطائیت کے خلاف! جس قوم کے عوام ایوب جیسے فوجی آمر کا تختہ الٹنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اس ملک کے اہلِ علم، طلباء، دانشور، فنکار اور عوامی قوتیں رحمان، سومار، آفتاب کو کیسے خاطر میں لا سکتی ہیں جو نوجوان اعلانِ تاشقند سے اکتوبر ۶۸ء کی جدوجہد تک سڑکوں کا رنگ اپنے لہو سے گلنار بنانے کے اہل ہوں وہ جوتی ٹوپی چھوڑ کر بھاگنے والے اگر تلہ ٹریبونل کے سر پنچ کو کیا اہمیت دے سکتے ہیں اور کیا یہ ایک محسوس ہونے والی حقیقت نہیں ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اگرتلہ کا "اسیر" برسرِ اقتدار آ رہا ہے بھٹو کو مغربی پاکستان میں اکثریت مل چکی ہے۔ عوام نے اور صحافیوں نے اپنی جنگ خود لڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔

خود انحصاری کی یہ پالیسی مظلوم طبقوں کی جدوجہد کو یقیناً آگے لے جاتی ہے اس لئے کہ پھانس نکالنے کی سب سے پہلی اور یقینی کوشش وہ کرتا ہے جسے پھانس چبھی ہو۔ جس تن لاگے سو تن جانے۔ عوام دشمن عناصر کو عوام خود فکس اپ کریں گے۔ انتظار نہیں کیا جائے گا۔ صحافیوں کی طبقاتی جدوجہد بہرحال کامیاب ہو گی۔ قلم کے مزدور "جنگ" جیتیں گے!!... "نذر السلام کی آواز آ رہی ہے۔ سنو! بنگالی کا باغی شاعر کہہ رہا ہے

بڑھے چلو ——— بڑھے چلو!
صدائے طبل گونجتی ہے دور تک فضاؤں میں
ستم رسیدہ سر زمیں کی مضطرب خلاؤں میں
شبابِ صبحِ نو تمہیں پکارتا ہے دوستو!
بڑھے چلو ——— بڑھے چلو!
نصیب میں عہدِ نو میں زندگی کی نزہتیں
رواں دواں ہیں چار سو صبا کی تازہ نکہتیں
بکھر رہے ہیں شام کی ظلمتوں کے تار و پو
بڑھے چلو ——— بڑھے چلو

لاہور حلقہ نمبر ۳ کے ضمنی انتخابات ہونے والے ہیں۔ قومی اسمبلی کی اس سیٹ پر مقابلہ پیپلز پارٹی کے رہنما میاں محمود علی قصوری اور حقہ ٹوپی پارٹی کے ایک کارکن کے درمیان ہے۔ ہماری مراد ملک اختر سے مار کھانے والے خواجہ رفیق سے ہے۔ پہلے خیال تھا کہ اس نشست پر میاں قصوری کے مقابلے میں نواب زادہ لیاقت علی خاں کے صاحبزادے مقابلے پر آئیں گے۔ مگر "پدرم سلطان بود" کا مزا جاوید اقبال چکھ چکے تھے اس لئے "صاحبزادہ" نے نوابزادہ "حقہ ٹوپی" اور سامراج پسندوں کی تجویز کو ردّ کر دیا۔ اور یوں بزرگوں کی ساکھ پر آنچ نہ آنے دی۔ یہ ایک صحیح فیصلہ تھا اس لئے عوام نے پسند کیا۔ ویسے بھی ایوبی دور کے چلے ہوئے کارتوس ——— عوامی سیاست کے دور میں "پھُس" ہو چکے ہیں۔ مزید تجربہ کرنا دانشمندی نہ تھا۔

اگلے روز ہمیں چند کتابیں درکار تھیں۔ کچہری روڈ پر واقع ایک مکتبہ میں ان کتابوں کی تلاش میں داخل ہوئے تو ایک ڈائیلاگ نے ہمیں ہمہ تن گوش کر دیا: "اب تو الیکشن جیتنے کا ایک ہی حربہ رہ گیا ہے...!" دوکاندار صاحب نے پوچھا: "کیا؟" پاس بیٹھے ہوئے وہی صاحب بولے: "دس پرنگ!" دکاندار نے سوال کیا: "وہ کیا

عوام دشمن عناصر کو عوام خود فکس اَپ کریں گے

ہوتی ہے ؟" اس سوال کا جواب حسب ذیل تھا۔

الفاظ ہمارے ہیں مگر مفہوم یہی کچھ تھا۔ آپ بھی سنیئے:

"اسلام کو خطرہ تو اب چل نہیں سکتا۔ اس نعرہ پر مزید وقت ضائع کرنا فضول ہے۔ اب تو ہمیں کھُلم کھلا پروپیگنڈا مہم چلانے کی بجائے ٹولیوں کی صورت میں ہر کونے میں وسپرنگ کرنا ہو گی۔ لوگوں کو سمجھانا پڑے گا کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ روٹی دال سے انسان کو اتنا پیار نہیں کرنا چاہیئے کہ تمام ووٹ ایک ہی پارٹی کو دے دیئے جائیں۔ دوسروں کو بھی تو آزمانا چاہیئے۔ اور قصوری تو ہے بھی سرمایہ دار اس لئے تھوڑی بہت طبقاتی نفرت بھی ابھارنی چاہیئے۔ کارکنوں کو چاہیئے جہاں کہیں لوگ کھڑے ہوں یا بیٹھے ہوں بات چھیڑ کر اپنا نظریہ عوام سے اتفاق کرتے ہوتے شامل کریں۔ پہلے ورکر آپس میں اختلاف کریں پھر آہستہ آہستہ متحد ہو کر اپنا نعرہ دیں ـــ وسپرنگ!"

دکان دار جو خود بھی "سام پسند" معلوم ہوتا تھا اس کے اس لاجواب فارمولے کو سن کر بولا "یار ہے تو معقول بات۔ پہلے کیوں نہ بتایا ظالم!"

ہم نے اپنے دل میں کہا ـــ "اب بچ کر کہاں جاؤ گے! عوام اب وہاں پہنچ رہے ہیں جہاں سے آگے تمہارے پسپا ہونے کی کوئی جگہ نہیں ـــ "ہتھیار" ڈالو۔ ہینڈز اپ! HANDS UP! ورنہ ...!

@

ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر رجعت پسندوں کا طبقہ ویسے تو شروع سے چلا آرہا ہے مگر جنرل شیر علی صاحب کے دورِ وزارت میں تو یہ معاملہ اندرا گاندھی اور آنجہانی شاستری کے "الوُٹ انگ" والا بن گیا تھا چنانچہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کانفرنس کے بعد لاہور ٹیلیویژن اسٹیشن پر بنگال کی ایک لوک کہانی پر مبنی ایک ڈرامہ "منجوما" پیش کیا گیا۔ تو وزیر موصوف نے اپنے خفیہ پنجے کو جنبش دی اور ڈرامہ کی نمائش باقی اسٹیشنوں سے روک دی کیونکہ ان کے خیال میں۔ ڈرامہ طبقاتی کشمکش کا باعث بنتا۔ ڈرامہ رک گیا مگر طبقاتی کش مکش چلتی رہی ـــ اور چلتی رہے گی جب تک غیر طبقاتی سماج قائم نہیں ہو جاتا کاغذ اور قالین کے شیرا سے نہیں روک سکتے۔ اب جبکہ عوام نے طبقاتی کشمکش کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے تو اس ڈرامہ پر پابندی کا کوئی جواز باقی نہیں رہا۔ اگر اس پر بھی پابندی واپس نہ لی گئی تو طبقاتی کش مکش روکنے والے رجعتیوں کو "فکس اپ" کرنا ضروری ہو گا۔ اس لئے ریڈیو اور ٹی وی عوام کی ملکیت ہیں نہ کہ رجعتی طبقوں اور ان کے پالتو ایجنٹوں کی۔ موجودہ حکومت کو اس معاملہ میں اپنے فرائض کا احساس کرنا چاہیئے۔ مزید چار ماہ انتظار کس خوشی میں کیا جاتے۔ اس میں دستوری جھمیلے کی کیا رکاوٹ ہے؟ ورنہ شاید انقلاب سے پہلے ایک ہلکا سا "ثقافتی انقلاب" برپا کرنا ضروری ہو جائے اس لئے کہ ملک کے دونوں حصوں میں طبقاتی پروگرام کے حق میں اظہارِ پسندیدگی ہو چکا ہے۔ نشر و اشاعت کے اداروں میں عوام دشمنوں کو زیادہ دیر برداشت نہیں کرنا چاہیئے۔ غیر جانبداری کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عوام کی پسند کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والے عناصر کو پناہ دی جائے اور بظاہر اس کا کوئی جواز بھی نہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی کسی کی بھی جاگیر نہیں اور نہ ہی الوُٹ انگ۔ یہ عوام کے پیسے سے چل رہے ہیں۔ انہیں عوام کے مفاد میں ہی استعمال ہونا چاہیئے۔

طلباء نے
ایوب خان
کا بنا بنایا
کھیل بگاڑ
دیا

لاہور کالجوں اور یونیورسٹیوں کا شہر ہے۔ جب یہ ادارے بند ہو جاتے ہیں تو شہر سونا سونا نظر آنے لگتا ہے الیکشن کے بعد لاہور کی رونقیں لوٹ آئی ہیں۔ پنجاب بھر سے کسانوں، مزدوروں کے بیٹے بیٹیاں اور متوسط طبقہ کے طلباء اپنی کلاسوں میں لوٹ آئے ہیں۔ ہر ادارے میں آجکل الیکشن کا زور شور ہے مقررین جو پہلے کسی زمانے میں ایم۔ اے کے ساتھی طلباء کو انتخابی امیدوار کی حیثیت سے متعارف کراتے ہوئے مڈل کے امتحان میں اپنے مڈل میں تیسری پوزیشن سے لے کر فٹ بال کی ٹیم کا گول کیپر ہونے تک کا شاندار ریکارڈ گنواتے تھے۔ اور بیت بازی کے مقابلے میں اپنے ماسٹر سے شاباش پانے کا ذکر بھی کیا کرتے تھے اب بہت آگے نکل آئے ہیں۔ اب طلباء اپنی یونینوں کے انتخابات "نظریات" کی بنیاد پر لڑنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ طلباء قوم کا ذہین ترین طبقہ ہیں "ذہن اور نظریے کا ساتھ ازلی ہے۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اب سے پہلے یہ سررشتہ "کیوں نظر نہیں آیا۔ یعنی یہ کیوں ہوا کہ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے بعد ہی طلباء اور سیاست قریب نظر نہیں آئے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ایوب شاہی دور میں اس بات پر زور دیا گیا کہ سیاست صرف چند افراد کا جدی ورثہ ہے۔ ایوبی "دانش ور" اخباروں اور کالجوں میں یہ پراپیگنڈہ کرتے رہے کہ طلباء کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (حالانکہ یہ بھی ایک سیاست تھی!) حتیٰ کہ یونیورسٹی آرڈیننس تک بنایا گیا مگر ایوبی قوانین کی زنجیروں کو طلباء نے قبول نہیں کیا۔ اور یہ طلباء ہی تھے جنہوں نے اس کے خلاف ایجی ٹیشن (AGITATION) کی ابتدا کی ـــ جو ایوب صاحب کو بہا کر ہزارہ کی پہاڑیوں پر چھوڑ آئی۔ اپنے منطقی انجام سے واقف ہونے کے باوجود ایوب خاں آخری دنوں تک کہتا رہا ـــ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ نوجوان جذباتی ہوتے ہیں۔ ترکی، جاپان اور فرانس میں بھی تو طلباء ہنگامے کرتے رہتے ہیں۔ لیکن حکومتوں کا یہ کیا بگاڑ سکتے ہیں؟"

مگر پاکستان میں ایوب کا بنا بنایا کھیل طلباء نے ہی بگاڑا۔ اور بات ہے کہ ان کی اس تحریک کو صنعتی مزدوروں

کسانوں اور عام شہریوں نے کمک پہنچا کر کامیاب بنایا بارشس کا پہلا ہی قطرہ طلباء ہی بنے تھے ... کراچی میں اس جدوجہد کا آغاز ۱۹۶۱ء، ۱۹۶۲ء میں ہو گیا تھا۔ جب معراج محمد خاں، حسین نقی، خرم، مسرز امرحوم، جوہر حسین اور رضوی وغیرہ کراچی بدر کئے گئے ہیں۔

اب تک جن طلباء کی یونینوں کے انتخابات ہوئے ہیں ان کے نتائج بائیں بازو کے نتائج ہیں ملکی سیاست کا رنگ طلباء کی سیاست میں بھی آگیا ہے بالخصوص گورنمنٹ کالج لاہور کی یونین سے بائیں بازو کی کامیابی بہت خوش آئند ہے۔ کیونکہ یہ ادارہ کسی زمانے میں سی ایس پی بنانے کی "فیکٹری" سمجھا جاتا تھا یہ بات شاید کلی طور پر اس وقت بھی نادرست تھی اقبال ــــ پطرس بخاری، بلراج ساہنی، صفدر میر بھی تو اس ادارہ سے وابستہ رہے تھے ــــ؟

نئے ٹیکسوں کے متعلق پنجاب کا ردِ عمل اچھا نہیں ہے۔ عام لوگ کہہ رہے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی امداد کے نام پر حکومت نے پیٹرول کی قیمت ایک روپیہ بڑھا کر مہنگائی کی لہر کو قوت بخش دی ہے۔ رکشا اور ٹیکسی متوسط طبقے کی سواری ہے۔ لاری میں عوام کی بھاری اکثریت سفر کرتی ہے۔ نیا ٹیکس ان لوگوں پر اثر انداز ہوگا جو اگرچہ طوفان اور سیلاب کی لہروں سے تو بچے ہوئے ہیں۔ مگر بے روزگاری، افلاس، بیماری اور تنگدستی نے ان پر زندگی حرام کر رکھی ہے... سوال یہ ہے کہ کیا وہ لوگ جو لاریوں کی چھتوں پر بیٹھ کر پائیدانوں میں لٹک کر دھکے کھا کر اور ان ہی لاریوں کے نیچے آکر ــ جی رہے، مر رہے ہیں، ان کا قصور یہ ہے کہ وہ مغربی پاکستان میں رہ رہے ہیں ــ جہاں تک افلاس کا تعلق ہے اس میں تو یہ لوگ بنگال کے غریب عوام کے ہمسفر ہیں ــ! کچھ لوگ یہ چہ میگوئیاں بھی کر رہے ہیں کہ دوسرے ممالک سے جتنا امدادی سامان آیا۔ کیا وہ بچے کھچے طوفانی علاقے کے عوام کے لئے ناکافی تھا ــ؟

یہ وہ سوالات ہیں، جو ہر ہوٹل، گلی بازار اور چوراہے میں ہو رہے ہیں۔ کیا حکومت کو ان سوالات سے دلچسپی ہے؟ یہ آخری سوال بالکل سیدھا ہے۔ جس کا جواب حکومت کو دینا چاہئے: کہ یہ ایک عوامی سوال ہے اپنی عارضی و عبوری حکومت سے ــ!

نیپ (ولی گروپ) سرداروں کے مسائل میں زیادہ دلچسپی لے رہی ہے

محمود مری بلوچ ــــ کوئٹہ

صوبہ سرحد کے علاقوں سے قومی اسمبلی کے چار منتخب نمائندوں کے مشترکہ کانفرنس میں قبائلی علاقہ کی حیثیت کو برقرار رکھنے کے مطالبہ کے فوراً بعد ہی بلوچستان کے سیاسی اور دانشور حلقوں میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ بلوچستان میں جہاں کا معاشرہ آج بھی خانہ بدوش اور قبائلی ہے۔ جہاں کی سیاست میں قبائلی نوابوں اور سرداروں کی بالادستی ہے۔ یہ مطالبہ قبائلی نظام کو برقرار رکھنے کا جواز تو نہیں دے گا؟ نیشنل عوامی پارٹی کے ترجمان اور مغربی پاکستان کے جنرل سیکرٹری میر غوث بخش بزنجو نے ۵ جنوری کی پریس کانفرنس میں نیپ کی مستقبل کی پالیسیوں کے بارے میں جو بیان دیا تھا اس کے بعد اس سوال میں زیادہ شدت پیدا ہو گئی ہے۔

میر صاحب کے الفاظ میں "مغربی پاکستان کی حکومت سے جو ہمارا تصفیہ ہوا تھا اس کے مطابق سارے علاقے سے پولیس واپس بلالی گئی مری بگٹی سے تمام فورس واپس بلائی گئی اور اس کے بجائے سرداروں کو ان علاقوں میں امن و امان برقرار رکھنے کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ اس تصفیہ کے بعد گذشتہ آٹھ نو ماہ سے کوئی ناخوشگوار واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔ پھر ان علاقوں میں ملیشیا کی یہ نقل و حرکت تشویشناک ہے۔ ہم بلوچستان ایڈمنسٹریشن کو مشورہ دیں گے کہ یا تو وہ اس اقدام کی وجہ ظاہر کرے تاکہ ہمیں اس کے جواز کا اطمینان ہو اور یا ان فورسز کو واپس بلا لیا جائے ــ"

بیان کے اس حصہ سے جو مطلب اخذ کیا جا رہا ہے وہ یہی ہے کہ بزنجو صاحب بلوچستان میں سرداری راج قائم کرنا چاہتے ہیں۔ بیان کے پہلے حصہ کو کہ "سرداروں کو امن و امان برقرار رکھنے کا ذمہ دار قرار دیا گیا" سیاسی کارکنوں، طلباء اور دانشور حلقوں نے نیشنل عوامی پارٹی کے منشور اور پروگرام کے خلاف قرار دیا ہے۔ ان طبقوں اور بائیں بازو کے خیالات رکھنے والوں کو اس حد تک کہتے سنا گیا کہ بلوچستان میں بھی قبائلی نمائندوں کے مطالبہ کی ہی طرح کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانا بعید از قیاس نہیں۔ وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ ایوب آمریت کے خلاف بلوچستان میں جو ردعمل ہوا اور تحریک چلی اور اس مزاحمت میں جو جو مظالم روا رکھے گئے ان کی مثال مشکل ہے۔ لیکن یہ تحریک جس انداز میں سرد خانے میں ڈال دی گئی وہ بھی بہت منفی تھا۔ چند قبائلی سرداروں کی سرداریاں سابق گورنر نور خاں نے بحال کیں اور ان کو لاہور میں شرف ملاقات بخشا۔ جس کے بعد سرداروں کو اپنے علاقوں میں تمام اختیارات حاصل ہو گئے اور وہ امن و امان بحال کرنے کے ذمہ دار قرار دیئے گئے۔

باشعور طبقوں میں یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ اب جبکہ انتخابات ہو چکے ہیں عوام نے اپنے نمائندوں کا انتخاب کر لیا ہے۔ آئندہ چند ماہ میں عوامی نمائندے اختیارات بھی سنبھال لیں گے اور امکان یہ بھی ہے کہ بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی ہی حکومت بنائے گی۔ تو ایسی صورت میں سرداروں کے مفاد کے لئے ہی آواز کیوں اٹھ رہی ہے؟ آخر وہاں کے انتظامات سرداروں کے ہاتھ میں کیوں ہوں؟ جبکہ نیشنل عوامی پارٹی کے منشور اور پروگرام میں سرداری نظام کے خاتمے کی یقین دہانی کرائی گئی۔ اسی طرح یہی طبقے عوامی مسائل کو نظر انداز کرنے کو بھی اس سلسلہ کی کڑی قرار دے رہے ہیں اور سوال کر رہے ہیں کہ جب اس بیان میں صوبے کے طلبار کو بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیجنا ایک مسئلہ قرار دیا گیا ہے تو خانہ بدوشی کی زندگی اور بلوچستان کا غلام سماج، جہاں آج بھی کھیت کا مزدور صدیوں پہلے کی طرح ایک آقا سے دوسرے آقا کے ہاتھ بک رہا ہے۔ مسئلہ کیوں نہیں؟ بلوچستان کے اس کھیت مزدور کو غلامانہ زندگی سے چھٹکارا دلانے کے بارے میں بلوچستان کے سیاسی رہنماؤں کی خاموشی معنی خیز ہے۔

لیکن نیشنل عوامی پارٹی کے قریبی ذرائع ان اندیشوں کو جذباتی قرار دے رہے ہیں۔ ان ذرائع کا کہنا ہے کہ میر صاحب کی یہ پریس کانفرنس فوری مسائل کی طرف حکومت کو متوجہ کرنے کے لئے کی گئی تھی نیشنل عوامی پارٹی اپنے جماعتی پروگرام اور منشور سے کسی بھی حالت میں روگردانی نہیں کرے گی۔

جہاں تک عوامی حلقوں کے اندیشوں اور ان کے بارے نیپ کے قریبی ذرائع کی وضاحت کا تعلق ہے، دو ٹوک فیصلہ دینا مشکل ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بلوچستان میں کھیت مزدور جو کہ پچاس فیصد آبادی پر مشتمل ہے نہایت ہی کس مپرسی کے عالم میں ہے۔ اور وہ حقیقتاً آج کے سائنسی اور سوشلسٹ دور میں بھی غلام سماج کے دور کی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں بکتا رہتا ہے۔ وہ صرف گرمیوں کے چار ماہ کھیتوں میں کام کرتا ہے۔ اور آٹھ ماہ تک اس سے بیگار لیا جاتا ہے خانہ بدوش طبقہ ان سے بھی بدتر حالت میں زندگی بسر کر رہا ہے اور ان تمام سے بدتر حالت نوابوں اور سرداروں کے مقرر کردہ لیویز اور قلیوں کی ہے، جن سے کام تو لیا جاتا ہے لیکن ان کو چالیس پچاس روپے کے قریب بھی تنخواہ نہیں دی جاتی اور یہی کارندے علاقے کے امن اور قانون کے سردار کی طرف سے محافظ ہوتے ہیں۔ ان طبقوں کے مستقبل کے بارے میں بلوچستان کی کسی بھی سیاسی جماعت نے آج تک کچھ نہیں کہا اور یہ خاموشی بلوچستان کے شدید مسائل کی موجودگی میں یقیناً معنی خیز ہے۔ لیکن نیشنل عوامی پارٹی کے بارے میں جو بلا شک و شبہ بلوچستان میں حکومت بنائے گی یہ کہنا کہ وہ جان بوجھ کر ان مسائل کو نظر انداز کرے گی اور اس صوبہ کو قبائلی سرداروں کا نیا جیل خانہ بنائے گی۔ اس مرحلہ پر بعید از قیاس ہے۔ بلاشبہ نیشنل عوامی پارٹی میں رجعت پسندوں کا ایک گروہ ہے جو یہ کوشش کر رہا ہے اور اپنے طبقاتی مفادات کے پیش نظر کرتا رہے گا کہ ان کی استحصالی حیثیت برقرار رہے۔ لیکن پارٹی میں بائیں بازو اور پر خلوص لوگوں کا اثر بھی نسبتاً بڑھتا جا رہا ہے۔ اور ان کی موجودگی میں ایسا فیصلہ جو کہ عوامی امنگوں کے خلاف ہو ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔

قارئین کہتے ہیں

انور سجاد کے ڈرامہ "منجر ما" سے پابندی ختم کی جائے

ناکام سابق وزیر اطلاعات اور اسلام پسندوں کے نظریاتی چوکیدار نواب زادہ شیر علی خان جا چکے ہیں۔ مگر ان کے عہد کی ایک بدترین یادگار ابھی تک موجود ہے۔ ڈاکٹر انور سجاد کے ڈرامہ "منجر ما" کی انتہائی غیر منصفانہ طور پر ٹیلی ویژن میں نمائش پر پابندی ابھی تک برقرار ہے۔ گذشتہ دنوں سامراج دشمن ہفت روزوں نے یہ سازش بے نقاب کرتے ہوئے صراحت کر دی تھی کہ کس طرح جماعت اسلامی کے کالم نویس ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے وزارت اطلاعات کے امریکی سامراج کے گماشتوں کو خوش کرنے کے لئے

سی آر اسلم ٹولے نے بھٹو کو امریکی ایجنٹ کہنا چھوڑ دیا ہے

جاوید امین عشرت - سرگودھا

سرگودھا کے جیالے عاشق حسین جعفری، جمیل اختر اور ہمراز احسن نے تحریک میں اپنا جو حصہ ادا کیا ہے اس نے انہیں سرگودھا کے عوام کا ہیرو بنا دیا ہے۔ جیل سے ان کی رہائی کے بعد یہاں کے لوگوں نے جس طرح ان کا خیر مقدم کیا ہے وہ ایک یادگار حیثیت رکھتا ہے گزشتہ دنوں ہمراز احسن رکن مرکزی مجلس عاملہ این ایس ایف کے اعزاز میں ایک مختصر سا استقبالیہ پیپلز گارڈ کے نوجوان اراکین کی طرف سے دیا گیا۔ اس محفل میں ہمراز صاحب نے خطاب کرتے ہوئے موجودہ صورت حال پر مکمل روشنی ڈالی۔ انہوں نے عام فہم انداز میں کہا کہ نوکر شاہی جاگیرداری اور سامراج کے گٹھ جوڑ سے پروان چڑھنے والا یہ نظام اب کھوکھلا ہو چکا ہے ترقی پسند قوتیں اپنی پوری قوت سے اسے ڈھانے کے لئے آگے بڑھیں۔ مزدور کسان ایک متحد قوت بن کر سرمایہ دارانہ نظام کی عفریت کو کچل دیں۔ انہوں نے زور دیا کہ پورے نظام کو بدلے بغیر اس سماج سے مسائل کے ناسور ختم نہیں کئے جا سکتے۔ مزدور کسان طبقوں کی حکومت ہی ان کے مسائل حل کر سکتی ہے۔ انہوں نے سی آر اسلم گروپ کے کردار اور عمل کا بھی تفصیلی تجزیہ کیا۔ اور ترقی پسندی کے نام پر ہونے والی سازشوں پر کڑی نکتہ چینی کی۔

سرگودھا شہر میں ابھی تک صرف پیپلز گارڈ ایک ایسا ادارہ ہے جو باقاعدہ نظریاتی طور پر نوجوانوں کو اکٹھا کر رہا ہے اور اس کے کارکن جن میں غازی امان اللہ، ارشد بخاری اور اکبر پیش پیش ہیں۔ لوگوں کو نظریاتی طور پر متحد اور مسلح کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ پیپلز گارڈ کے نوجوان مولانا کوثر نیازی، معراج محمد خاں، تسنیم زین الدین، طارق عزیز وغیرہ سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ پیپلز گارڈ کی اب تک سرگرمیوں کے بعد سرگودھا میں وہی ایک ایسی تنظیم نظر آتی ہے جو نہ صرف انقلابی قوتوں کو اکٹھا کر رہی ہے۔ بلکہ انقلاب کی قیادت کرنے کی ذمہ داریاں پوری کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ نیپ کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ لوگ بتاتے ہیں کہ ہم بیس سال سے سوشلسٹ ہیں۔ پوچھا جائے کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں تو جواب ہوتا ہے کہ سرگودھا میں کوئی ترقی پسند تحریک نہیں تھی۔ لہذا ہم کیا کرتے، جیل جانے کو وہ سستی شہرت کہتے ہیں۔ بہر حال سات تاریخ کے بعد سے انہوں نے بھٹو اور پیپلز پارٹی کو امریکن ایجنٹ کہنا بند کر دیا ہے اور تعریف کے موڈ میں ہیں۔ ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔

اس ڈرامہ پر بے سروپا اعتراضات کئے تھے۔ ان کا مجموعی الزام یہ تھا کہ اس ڈرامے سے طبقاتی کشمکش کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اصولی طور پر "مشرق" میں ٹیلی ویژن کے پروگراموں پر عشرت رحمانی کالم لکھتے تھے مگر ان کا کالم روک کر صحافتی بداخلاقی کا ثبوت دیتے ہوئے عبدالسلام خورشید سے بقول شہاب ایک سازش کے تحت کالم لکھوا کر چھپوایا گیا۔ ان دنوں سنا تھا کہ عشرت رحمانی احتجاج کے طور پر "مشرق" اخبار سے قلمی معاونت کا سلسلہ منقطع کر چکے ہیں۔

میں اپنے دوست افسانہ نگار ڈاکٹر انور سجاد کو پہلے بھی اس ڈرامہ پر مبارک باد دے چکا ہوں۔ اور اب بھی اس مبارک باد کا اعادہ کرتا ہوں۔ اور آپ کی وساطت سے حکومت سے مطالبہ کرتا ہوں کہ "منجر ما" پر سے پابندی اٹھائی جائے۔ کیوں کہ حالیہ انتخابات میں بھی عوام نے طبقاتی شعور کا بے مثال مظاہرہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے تمام قلم کاروں کو اس سلسلے میں آواز اٹھانی چاہیئے اور حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیئے کہ "منجر ما" پر پابندی لگانے کی سازش کے محرکات کا پتہ چلائے۔ اور سرکاری و غیر سرکاری ذمہ دار افراد کو کیفر کردار تک پہنچائے۔

حامد جیلانی
شعبۂ صحافت پنجاب



محمود علی قصوری



علی احمد تالپور

ضمنی انتخابات رجعت پسندوں کا چہلم ثابت ہوئے

پاکستان پیپلز پارٹی نے سندھ اور پنجاب میں ضمنی انتخابات میں جو شاندار کامیابی حاصل کی ہے، اس سے ایک بار پھر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ عوام دشمنوں کا محاذ عوام دوستوں کے مقابلے میں ہرگز جم نہیں سکتا۔ سندھ میں میر علی احمد تالپور کے مقابلے میں قریب ترین مخالف کو جو عبرت ناک شکست ہوئی ہے، اس کے نتیجے میں اس کی ضمانت تک ضبط ہو گئی ہے۔ ٹھٹھہ کی نشست پر مخدوم امین فہیم کی کامیابی پیپلز پارٹی کی بے پناہ مقبولیت کا بین ثبوت ہے۔

لاہور میں ضمانت ضبط مہم نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے ہیں۔ میاں محمود علی قصوری نے اپنے مخالف خواجہ رفیق کا برج الٹا دیا ہے اور زندہ دلان لاہور نے ایک مرتبہ اور اپنے فیصلے پر مہر تصدیق ثابت کر دی ہے۔ ۷؍دسمبر سے ۷؍جنوری تک کا عرصہ نام نہاد اسلام پسندوں کے اتحاد اور گٹھ جوڑ کا دور تھا۔ عوام نے ۷؍دسمبر ۱۹۷۰ء کو جس انداز میں ان کے عزائم کو خاک میں ملایا تھا، پورے چالیس روز کے بعد اس کی رسم چہلم بھی پوری تیاریوں کے ساتھ ادا کر دی لاہور نے عوام دشمنوں کو باور کرا دیا ہے کہ انہوں نے پھر سر اٹھایا تو بری طرح بھی مسلنے سے گریز نہیں کیا جائے گا۔

ملتان میں نام نہاد اسلامی متحدہ محاذ کے امیدوار بابو فیروز الدین انصاری کا حشر بھی برا ہوا۔ صاحبزادہ فاروق علی خاں کی کامیابی کے پس منظر میں پیپلز پارٹی کے نوجوان قائد خان اشفاق احمد خان ایڈووکیٹ (اللہ وسایا طرز فہیم) کی جو صلاحیتیں کارفرما تھیں وہاں عوام کی جانب سے پیپلز پارٹی کے اس فیصلے کی بھی تصدیق ہو گئی ہے جس کے تحت بابو فیروز الدین انصاری کو پارٹی سے نکالا گیا تھا۔ مقبوضہ پریس نے اس کی آڑ میں آسمان سر پر اٹھا لیا تھا اور عوام کو بھرپور تاثر دیا کہ ملتان میں بابو صاحب کے بعد پیپلز پارٹی کا کوئی نام لیوا نہیں۔ ۷؍دسمبر ۱۹۷۰ء کو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو اور اب ۱۷؍جنوری کو صاحبزادہ فاروق علی خاں کی کامیابی نے مقبوضہ پریس کو زناٹے دار تھپڑ رسید کیا ہے اس پر میر خلیل الرحمان یقیناً اپنے نمائندہ ملتان کی وہ رپورٹیں یاد کریں گے جو مودودی جماعت کے دفتر میں تیار ہو کر جنگ کے صفحۂ اوّل کی زینت بنتی تھیں۔



مسٹر راشد ربانی پیپلز پارٹی کے رہنما میاں رفیق کو ہار پہنا رہے ہیں۔



حافظ محمد احمد صوبائی اسمبلی کے کامیاب امیدوار عبدالوحید عرشی کو مبارکباد پیش کر رہے ہیں۔

بقیہ :۔ چترال

رہے ۔ اس بزدلانہ اقدام سے عوام کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ وہ جاگیرداروں، شہزادوں اور لیٹروں کے خلاف سینہ سپر ہیں۔ چترال میں عوامی تحریک بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔

چترال کے عوام چاہتے ہیں کہ کالا قانون کہنہ ایکٹ فوراً منسوخ کیا جائے تاکہ عوام غاصبوں سے اپنی زمینیں واپس لے سکیں۔ شہزادوں اور جاگیرداروں کا وظیفہ بند کر کے چترال میں اسکول کھول دیے جائیں۔ اس علاقے میں خواتین کے علاج معالجے کے لئے لیڈی ڈاکٹر کا فوری تقرر عمل میں لایا جائے درہ لواری کو سرنگ کر کے مستقل سڑک بنائی جائے۔ پاکستان کے تمام قوانین چترال میں نافذ کئے جائیں جنگلات کو عوام کی ملکیت قرار دیا جائے اور ان کی آمدنی سے گرم چشمہ اور بونی میں بیس بیس بستروں کے ہسپتال اور چترال میں بجلی گھر قائم کئے جائیں۔ معدنیات پر سے شہزادوں کا تسلط ختم کیا جائے۔ جبری مشقت لینا جرم قرار دیا جائے اور قلنگ کے نام پر چرواہوں سے گھی وصول کرنے والوں کو کوڑے مارے جائیں۔

بقیہ: ہارون ملز میں ہڑتال

جس میں جنرل سیکرٹری بھی شریک تھے اور اسی میں خلیل کو ٹھیکہ دینے کی اسکیم منظور کی تھی۔

۱۷ نومبر کو یونین کے انتخابات کا ڈرامہ رچایا گیا۔ مزدوروں نے ان انتخابات کا مکمل طور پر بائیکاٹ کیا۔ لہٰذا فیڈریشن نے اپنے پاک کالونی کے دفتر میں چند لوگوں کو جمع کر کے عہدوں کی بندر بانٹ کا کھیل رچا لیا۔ فنڈز پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے اپنے پرانے آدمی محمود شاہ کو کیشیئر بنا دیا گیا۔ تاکہ یونین مزدوروں کے پاس چلی بھی جائے تو فنڈز لے کر بھاگنے میں زیادہ دقت پیش نہ آئے۔

یونین کے فنڈز میں خرد برد کا یہ چکر خاصا پرانا ہے۔ یونین کے پہلے جنرل سیکرٹری پہلے سے سوچے سمجھے ایک منصوبے کے تحت ۴۴ ہزار ۸ سو ۴۴ روپے کا غبن کر کے روپوش ہو گئے۔ ان کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی۔

روزنامہ **الفتح** کراچی

کے سلسلے میں اہم

اعلان

قارئین کرام اور ہمارے اکثر احباب نے اصرار کیا ہے کہ

روزنامہ **الفتح** کراچی

کے کم سے کم شیئر کی قیمت دس ۱۰ روپے مقرر کر دیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس نیک مہم میں حصہ لے سکیں
اس سلسلے میں ضروری کاغذات تیار کئے جا چکے ہیں۔ جو احباب یہ حصص خریدنا چاہتے ہیں وہ اس پتے پر
منی آرڈر، چیک، ڈرافٹ بھیج کر شیئر خرید سکتے ہیں۔

تمام عوام دوست طاقتوں سے تعاون کی توقع ہے

پتہ یہ ہے

الفتح پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۸۷ ڈی نرسری کمرشل ایریا۔ کراچی

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
21— 28, JANUARY. 1971



شیخ مجیب الرحمٰن، جن کے بارے میں موجودہ عبوری حکومت کے سربراہ جنرل یحییٰ نے کہا ہے کہ وہ ملک کے آئندہ وزیر اعظم ہونگے